نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان کے باہر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ

ششماہی چندہ میں "نگار" کا جنوری نمبر
بوجہ اضافۂ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ہمیشہ یاد رکھئے کہ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع اگر اُسی مہینے کے اندر نہ دی گئی تو آیندہ مہینے کے اخیر تک پانچ پیسے کے ٹکٹ آنے پر دوبارہ روانہ ہوگا (کیونکہ ڈاک خانہ اب پچھلے پرچوں کا محصول پنج گنا وصول کرتا ہے) اور اُس کے بعد قیمتاً یعنے ۸ر کے ٹکٹ وصول ہونے پر۔

منیجر "نگار"

جلد ۳۸	فہرست مضامین اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء	شمار ۴

ملاحظات ---------------- ۲
اُس لڑائی کے بعد اور اِس لڑائی سے پہلے ---------------- ۹
شہرتِ عام کا دربار ---------------- سراج احمد علوی ---------------- ۱۸
کارگاہ قدرت میں عزمِ انسانی کی دلچسپ داستان ---------------- ۲۵
عقل کی حماقتیں ---------------- ۳۱
سُہاگ ---------------- مرزا ظفر الحسن بی-اے ---------------- ۳۳
پروپیگنڈا ---------------- خواجہ احمد فاروقی بی-اے ---------------- ۳۵
اعترافِ گناہ ---------------- انور ---------------- ۴۲
گاندھی جی اور فلسفۂ عدم تشدد ---------------- رام ---------------- ۵۴
مکتوبات نیاز ---------------- ۵۷
باب الاستفسار ---------------- ۶۱
مطبوعات موصولہ ---------------- ۶۶
منظومات ---------------- تمکین - اثر - کوکب - ماہر - فراق - راج - ساحر - محب - شور - جگنو - نظر ---------------- ۷۱

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد - ۳۸	اکتوبر سنہ ۴۰ء	شمارہ - ۴

ملاحظات

رفتارِ جنگ

فرانس کی شکست کے بعد، خیال کیا جاتا تھا کہ شاید برطانوی حکومت جرمنی سے صلح کرلے گی اور اگر مسٹر چمبرلین کی وزارت برسرِ اقتدار ہوتی تو غالباً صلح ہو بھی جاتی، لیکن چرچل کے زمانہ میں صلح کا کوئی امکان نہ تھا اس لئے نازی حکومت کی کوشش کے باوجود بھی لڑائی ختم نہ ہوئی اور جنگ کا ایک تیسرا دور شروع ہوگیا جو یقیناً زیادہ سخت و صبر آزما ہے۔

اس لڑائی کے چھڑنے سے پہلے ہٹلر اور اس کے رفیقوں نے لڑائی کا ایک پروگرام طیار کرلیا تھا اور اس میں شک نہیں کہ فتح فرانس تک اس پروگرام کی تکمیل بالکل اسی طرح ہوتی رہی جس طرح انھوں نے سوچا تھا، لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا یا ہورہا ہے وہ یقیناً ان کی توقع کے خلاف ہے۔ پچھلا سال اس میں شک نہیں نازیوں کے لئے بہت مُبارک ثابت ہوا اور یوروپ کا اتنا بڑا علاقہ ان کے ہاتھ آگیا کہ جرمنی کی گزشتہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک طرف پولینڈ سے لیکر ناروے تک، دوسری طرف حدودِ بالٹک سے فرانس تک اس وقت جدھر دیکھئے نازی جھنڈا لہرا رہا ہے اور شمال یوروپ کی وہ تمام حکومتیں جو اپنی پیداوار دولت اور صنعت و حرفت کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز کی مالک تھیں سب کی سب نازی اثر میں آگئی ہیں۔ ناروے، ڈنمارک،

بلجیم، ہالینڈ اور نصف سے زیادہ فرانس، اس وقت ہٹلر کی حکومت میں شامل ہے اور اگر لڑائی موجودہ حدود پر ختم ہو جائے تو اس میں شک نہیں کہ نازی افواج دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی عسکری قوت ہونے کا فخر لیکر واپس آئیں گی۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ کسی ملک کو فتح کر لینے سے زیادہ مشکل فتح کے نتائج کو قایم رکھنا ہے، چنانچہ ہٹلر کی بے چینیاں بھی اسوقت انھیں فتوحات کو قایم رکھنے سے متعلق ہیں

ہٹلر اچھی طرح جانتا ہے کہ کامیابی کی صورت میں بھی وہ یوروپ کے ان ممالک پر قابض نہیں رہ سکتا جو اس کے قبضہ میں آچکے ہیں۔ کیونکہ وہاں کی آزاد قومیں غلامی کی زندگی کو عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتیں اور تیغ و تفنگ کی حکومت عارضی ہوا کرتی ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ جس وقت یہ جنگ ختم ہو تو علاوہ پولینڈ اور زیکوسلیوکیا کے جن پر قبضہ رکھنا وہ اپنا قومی فرض سمجھتا ہے، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کے بعض ساحلی مقامات پر بھی اس کا اقتدار قایم رہے اور ممالک یوروپ کی جدید تنظیم نازی اثرات کے تحت قرار پائے

لیکن ان تمام امیدوں کی راہ میں برطانیہ کا سنگ گراں حایل ہے اور جب تک یہ مانع دور نہ ہو جائے ہٹلر کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے بہ حالاتِ موجودہ ملک گیری کا سوال نہ جرمنی کے سامنے ہے نہ برطانیہ کے بلکہ یہ جنگ ہے "آمریت اور جمہوریت" دو متضاد اُصول کی اور اس میں کلام نہیں کہ کرۂ زمین کے بسنے والوں کی آیندہ قسمت کا فیصلہ بہت کچھ اس جنگ کے نتیجہ پر منحصر ہے۔ یقیناً ہم برطانوی جمہوریت کو معیاری اُصولِ حکومت نہیں کہہ سکتے، اور جس حد تک سیاہ فام قوموں کا تعلق ہے، دُنیا کی کوئی سفید رنگ جمہوریت اپنے اُن فرایض کو ادا نہیں کرتی جو صحیح جمہوریت کے نقطۂ نظر سے اس پر عاید ہوتے ہیں تاہم ایک بُری سی بُری جمہوریت بھی اچھی سی اچھی آمریت سے بہتر ہے اور اسی لئے ساری دُنیا اس جنگ کے نتیجہ کی طرف سے بہت فکر مند ہے

ہٹلر نے خیال کیا تھا کہ اس کی ہوائی تاخت، انگلستان کی آبادی میں بے چینی پیدا کر دے گی اور وہ اس بد دلی سے فایدہ اُٹھا کر برطانوی حکومت کو دبانے میں کامیاب ہو جائے گا، لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا۔ تین مہینے سے زیادہ زمانہ گزرا کہ وہ اسی کوشش میں مصروف ہے لیکن اس وقت تک برطانوی آبادی کے عزم و ارادہ میں کوئی کمی پیدا نہ ہوئی

یہ بالکل صحیح ہے کہ انگریزوں کی فضائی قوت اب بھی جرمنی سے کم ہے اور اب سے تین مہینے پہلے تو بہت ہی کم تھی (چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اگر جرمنی کے یہی ہوائی حملے انگلستان پر چند مہینے قبل ہوتے، تو شاید برطانوی حکومت برداشت نہ کر سکتی) لیکن اب اس کمی کو بڑی حد تک پورا کیا گیا ہے اور انگریزی جہاز بھی برابر کا جواب دینے لگے ہیں۔ اس لئے انگلستان پر حملہ کرنے کی جو اسکیم، ہٹلر کے سامنے تھی وہ تقریباً ختم ہو چکی ہے اور جاڑوں میں تو خیر یوں بھی اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اگر اسوقت جرمنی، انگلستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو ہم اس لڑائی کو ختم سمجھ لیں۔ جنگ برابر جاری رہے گی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اور زیادہ خطرناک وسعت اختیار کر لے۔

اس کے سمجھنے کے لئے، ہمیں یورپ کی بعض دوسرے، ملکوں کی حالت پر بھی نظر ڈالنا چاہئے۔ لڑائی سے پہلے جہاں جہاں امکانات جنگ پائے جاتے تھے، وہیں اب بھی ہیں۔ بحر روم، مشرق وسطی اور مشرق بعید یہ تین جگہیں ایسی تھیں جہاں آتش جنگ کے مشتعل ہوجانے کا اندیشہ کیا جاتا تھا اور یہ اندیشہ آہستہ آہستہ واقعہ کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے

فرانس کے مغلوب ہونے کے بعد جب اٹلی نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تو بحر روم میں جس لڑائی کے چھڑ جانیکا اندیشہ تھا وہ تو چھڑ گئی، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اٹلی نے یہ اقدام اس خیال وطیاری کے ساتھ نہ کیا تھا کہ اسے عرصہ تک اس میں الجھ جانا پڑے گا۔ نازیوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات کو دیکھ کر مسولینی کو یقین ہوگیا تھا کہ اول تو برطانیہ کسی نہ کسی بہانہ سے صلح کرلیگا اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر وہ جرمنی حملہ کی تاب نہ لاسکے گا، گویا ۱۵ راگست تک ہٹلر کے داخلۂ لندن پر اسے پورا بھروسہ تھا، لیکن جب نتیجہ خلاف امید نکلا اور لڑائی اُلجھ کر رہ گئی، تو ہٹلر کی طرح اسے بھی فکر ہوئی کہ آئندہ کیا کرنا چاہئے

ظاہر ہے کہ جنگ اب اس حد سے گزر چکی ہے کہ ہٹلر اور مسولینی خود اپنے اختیار سے اس کو ختم کرسکیں، وہ لڑنا نہ چاہیں گے تو بھی انھیں لڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ کوئی ایک فریق ہتھیار ڈالدینے پر مجبور ہوجائے۔ پھر اس صورت میں ہٹلر اور مسولینی کے سامنے یہی ایک تدبیر ہوسکتی ہے کہ وہ لڑائی کے دو چار محاذ اور پیدا کر کے برطانیہ کو اپنی قوت تقسیم کردینے پر مجبور کریں۔

برطانیہ کے سامنے انگلستان کا سوال اتنا اہم نہیں ہے جتنا مشرقی مقبوضات اور خاصکر ہندوستان کا۔ اس لئے اگر اسے اپنے ان مقبوضات کے تحفظ کے لئے یورپ کی سرزمین سے باہر کہیں جنگ کرنا پڑی تو یہ اس کے لئے کوئی فال نیک نہ ہوگی ۔ اور ۔ پھر اس سلسلہ میں بحر روم، جبرالٹر اور نہر سویز کا مسئلہ اس کے لئے بہت زیادہ اہمیت اختیار کرلیگا

مسولینی، بحر روم کو اطالوی جھیل کہتا ہے اور اس پر قبضہ کرنا وہ اپنا فطری حق سمجھتا ہے، لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ بحر روم برطانیہ حکومت کے لئے بھی شہ رگ کا حکم رکھتا ہے اور اگر آج پانی کا یہ حصہ اس کے لئے ناقابل گزر ہوجائے تو پھر مشرق سے اس کے تعلقات بالکل ختم ہوجاتے ہیں

سب سے زیادہ اہم مقام جس کی حفاظت برطانیہ کے لئے ضروری ہے، جبرالٹر ہے جو اسپین اور افریقہ کے درمیان ۲۰۶ میل چوڑے بحری راستہ کا محافظ ہے، اگر جبرالٹر انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ انگلستان کا کوئی جہاز نہ اسکندریہ پہونچ سکے گا اور نہ ہندوستان ۔۔ اس وقت تک لڑائی کی خبروں میں جبرالٹر کا ذکر نہ آتا تھا، لیکن اب آنے لگا ہے اور نازی وفاسسٹی حکومت کی طرف سے اسپین پر زور دیا جارہا ہے کہ اگر وہ خود جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتا تو نازی، واطالوی افواج کو اپنے ملک سے گزرنے کی اجازت دے۔ اسپین کا وزیر سونیر برلن سے گفت وشنید کے بعد واپس جاچکا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جنرل فرینکو ملک کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے کبھی لڑائی کی ہمت نہ کرے گا، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ ہٹلر اور مسولینی کے کہنے کو ٹال نہیں سکتا، کیونکہ اس کی حکومت انھیں دو کی امداد سے قایم ہوئی ہے اور نازی افواج ہر وقت فرانس کے راستہ سے اس پر تاخت کرسکتی ہے

جبرالٹر پر بحر روم کی طرف سے نہ کوئی حملہ ہوسکتا ہے اور نہ اس کی کامیابی کا امکان، لیکن خشکی کی طرف سے براہ اسپین ہر وقت اس کا امکان ہے اور یہ بات ناممکن نہیں کہ پشت کی طرف سے حملہ کرکے جبرالٹر پر قبضہ کرلیا جائے یا اس کے استحکامات کو تباہ و برباد کردیا جائے۔ حال ہی میں فرانس کے ہوائی جہاز حملۂ ڈکر کے جواب میں جبرالٹر پر بم برسا چکے ہیں اور ہٹلر نہیں تو ہٹلر کے دباؤ سے جنرل پیٹان کی فرانسیسی حکومت نے اس حملہ کی ابتدا کردی ہے۔ اس لئے جبرالٹر کا مسئلہ بہت نازک ہوتا جارہا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اسی موسم سرما میں یہاں لڑائی کی آگ مشتعل ہوجائے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم یقین کے ساتھ کسی نتیجہ پر حکم نہیں لگا سکتے، لیکن ایک بات یقینی ہے کہ خشکی کے راستوں سے نازی افواج کا مقابلہ آسان نہیں اور نہ برطانوی فوجیں اسپین کی سرزمین تک پہونچکر اس اقدام کو روک سکتی ہیں۔ ساحل کی طرف سے بیشک برطانوی فوجیں اُتاری جاسکتی ہیں، لیکن چونکہ اِدھر بحر روم میں اطالیہ مزاحم ہوگا، اس لئے بحری راستہ سے بھی پوری کمک نہیں پہونچ سکتی

اس میں شک نہیں کہ امریکہ، روز بروز برطانیہ سے قریب ہوتا جارہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ ایک دن دونوں جگہ کی فوجیں دوش بدوش کام کرتی نظر آئیں، لیکن امریکہ کی شرکت کے بعد بھی مسئلۂ جبرالٹر کی دشواری بدستور قائم رہتی ہے

اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مشرقِ بعید میں جاپان کی پالیسی بہت جارحانہ ہوتی جارہی ہے اور وہ نہ صرف انڈوچائنا، بلکہ برما اور سنگاپور پر بھی للچائی ہوئی نگاہیں ڈال رہا ہے تو ہمیں اس کا یقین ہوجاتا ہے کہ ڈکٹیٹروں کی حکومتوں نے آیندہ جنگ کا کیا نقشہ بنایا ہے

جاپان، اٹلی اور جرمنی کے درمیان جو معاہدہ حال ہی میں ہوا ہے اس کا مقصود بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اور روس کو اس جنگ میں شریک ہونے سے باز رکھا جائے، لیکن فی الحقیقت یہ پیش قدمی ہے آیندہ کسی نہ کسی ایسا بہانہ پیدا کرنے کی جو مشرق میں بھی لڑائی کی آگ کو مشتعل کردے۔ جاپان کا یہ تسلیم کرلینا کہ یوروپ کی حکومتوں میں تنظیم جدید کا حق صرف جرمنی و اٹلی کو حاصل ہے اور جرمنی و اٹلی کا یہ مان لینا کہ مشرق میں اقتدار قایم کرنے کا استحقاق صرف جاپان کو حاصل ہے، آمرانہ حکومتوں کے آیندہ ارادوں پر کافی روشنی ڈال رہا ہے

ان تینوں حکومتوں کے اس معاہدہ نے بہت سے شبہات زایل کردئے ہیں اور آیندہ نقشۂ جنگ کے متعلق گومگو کی حالت بڑی حد تک دور ہوچکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر جاپان کے اقدامات نے جن کا رُخ فی الحال انڈوچائنا کی طرف ہے، کوئی صورت ایسی پیدا کردی کہ امریکہ کو بھی جنگ میں شریک ہونا پڑا تو پھر یہ آگ جبرالٹر سے لیکر ہندوستان، بلکہ ہندوستان سے بھی آگے آسٹریلیا اور جزایر بحر ہند تک پھیل جائے گی اور دشمن کی کوشش یہ ہوگی کہ بحر روم کی طرف سے اٹلی و نازی افواج کا دباؤ اور مشرق کی طرف سے جاپانی قوت کا دباؤ ڈال کر دونوں ہندوستان کو اپنے درمیان میں لے لیں اور برطانیہ کو مجبور کردیں کہ وہ اپنی توجہ انگلستان سے ہٹا کر ہندوستان کی طرف مبذول کرے

دوسرا محاذ جنگ غالباً یونان و شام کی سرزمین میں پیدا کیا جائے گا۔ چونکہ فرانس کی شکست نے اس کے مقبوضات

میں دو عملی کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ اجتماعی قوت کا شیرازہ درہم برہم ہو چکا ہے، اس لئے دوسرے ممالک اس سے فایدہ اُٹھانا چاہتے ہیں، انڈوچائنا میں جاپان جو کچھ کر رہا ہے، اس سے ہر شخص واقف ہے اور گمان غالب یہی ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائے گا، دوسری طرف شام سے اطالیہ نے جو مطالبات کئے ہیں ان کو رد کرنے کی ہمت بھی کسی میں نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یونان کو اپنے بعض جزایر بحر روم کے اٹلی کے حوالہ کر دینے پڑیں گے اور اگر اس نے ایسا نہ کیا، تو پھر لڑائی چھڑ جائے گی، جس میں ترکی کو بھی لامحالہ شریک ہونا پڑے گا۔ اس مسئلہ پر روس کی پالیسی البتہ بہت کچھ اثر انداز ہو سکتی ہے لیکن چونکہ رومانیا پر نازی اثرات قایم ہو جانے کی وجہ سے بحر اسود میں روس کی آزادی باقی نہیں رہی، اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ یوں آسانی سے، نازی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے گا، گمان غالب یہی ہے وہ بدستور خاموش رہے گا اور جب پلہ کسی فریق کا جھکا ہوا دیکھے گا تو اپنا وزن بھی اسی طرف ڈالدے گا

اس سے انکار ممکن نہیں کہ روس، کبھی اس کو پسند نہیں کر سکتا کہ جرمنی اور جاپان کامیاب ہوں، کیونکہ انھیں کی کمزوری اس کی اصل قوت ہے، لیکن وہ حتی الامکان ان سے جنگ کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس وقت تک جس پالیسی سے اس نے کام لیا ہے وہ اس کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ نصف پولینڈ بالٹک ریاستیں اور رومانیا کا مشرقی علاقہ پر اس نے جس طرح قبضہ کیا ہے وہ دنیا کی تاریخ میں یادگار چیز ہے۔ اسٹالین کی انتہائی عقلمندی تھی کہ اس نے چمبرلین کی کمزور وزارت سے فایدہ اُٹھا کر بغیر لڑے ہوئے یہ سب کچھ حاصل کر لیا، اور اس کی حماقت ہوگی اگر اس نے کسی فریق کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں حصہ لیا، کیونکہ اب اسے کچھ اور ملنا نہیں اور جو کچھ اس کو مل چکا ہے اس کی واپسی کا سوال فی الحال پیدا ہونا نہیں

وہ سمجھتا ہے کہ جنگ جو صورت اختیار کرے اس کا فایدہ ہے اگر برطانیہ کو شکست ہوتی ہے تو اس کا فی الحال کوئی نقصان نہیں، کیونکہ جرمنی کو یہ کامیابی اتنی مہنگی پڑے گی کہ شاید وہ عرصہ تک روس کا خیال دل میں نہ لا سکے، اور اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو اسے یقین ہے کہ نازی دور ختم ہونے کے بعد وہاں اشتراکی دور ہی قایم ہوگا اور یہی اسٹالین کا عین مقصود ہے

سواحلِ بحر روم کے مسئلہ میں، مصر کا سوال بھی سامنے آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اٹلی نے اس پر حملہ بھی کر دیا ہے، لیکن میری رائے میں یہ بات بہت مشکوک ہے۔ اس وقت تک جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مطروح، سلوم اور ایک اور مقام پر اٹلی نے حملہ کیا ہے، لیکن ان مقامات پر مصر کا پہلے ہی سے حقیقی معنے میں قبضہ نہ تھا اس لئے ان حملوں کو نہ مصر نے کوئی زیادہ اہمیت دی ہے اور نہ وہ ان حملوں کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونا ضروری خیال کرتا ہے

حال ہی میں جو تبدیلیاں مصر کی وزارت میں ہوئی ہیں اُن سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہاں کی حکومت ابھی تک جنگ کے لئے طیار نہیں اور وہ آخر وقت تک اس سے بچنا چاہتی ہے بشرطیکہ آنکہ اس پر کوئی غیر معمولی دباؤ نہ پڑا

اس سلسلہ میں یہ امر بھی غور طلب ہے کہ کیا انگلستان تنہا ان تمام دشواریوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکتا ہے۔

اس وقت تک اس نے جرمن حملوں کو جس کامیابی سے دفع کیا ہے اس سے آیندہ کے لئے بہت کچھ امیدیں پیدا کردی ہیں، لیکن اگر لڑائی مشرقِ بعید میں بھی شروع ہوگئی تو پھر اس میں امریکہ کو بھی شریک ہونا پڑے گا اور ان دونوں کی متحدہ قوت یقیناً نہ صرف بحرِ روم بلکہ بحرِ ہند میں بھی اٹلی اور جاپان کا مقابلہ آسانی سے کرسکتی ہے

لیکن اگر یہ آگ مشرقِ بعید تک نہ پہونچی اور مشرقِ وسطیٰ تک محدود رہگئی تو پھر سب کو ترکی کا منھ دیکھنا پڑے گا اور اسکے اختیار میں ہوگا جس کا پلہ چاہے جھکادے - اس وقت تک ترکی کا رجحان، برطانیہ کی طرف ہے، لیکن آیندہ اس کے مصالح کیا ہوتے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا

بہرحال موسمِ سرما دُنیا کے لئے بہت سے تلخ تجربات اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کس کے حصہ میں کتنی تلخیاں آئیں گی

کانگرس، مُسلم لیگ اور حکومتِ ہند

ایک زمانہ سے ان تینوں کے درمیان ہندوستان کے موجودہ و آیندہ نظام کے متعلق گفتگو ہورہی ہے، لیکن ہنوز کوئی فیصلہ نہیں ہوا، اور نہ ہونے کی توقع ہے

سب سے آخری فیصلہ، کانگرس کیا بلکہ مہاتما گاندھی نے یہ کیا تھا کہ اگر حکومت اہلِ ہند کو اتنی انفرادی آزادی دیدے کہ جنگ کے متعلق ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کھُلم کھُلا کرسکے (خواہ وہ جنگ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو)، تو کانگرس، حکومت کے ساتھ تعاوُن کے لئے طیار ہے

اس تجویز کی چھپی ہوئی مصلحت جو کچھ ہو، لیکن بظاہر اس سے زیادہ بے معنی بات کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ اسکا مفہوم صرف یہ قرار پاتا ہے کہ "ہم جنگ میں انگریزوں کی مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں بشرط آنکہ ہم کو مدد نہ دینے کا اختیار حاصل ہو"

اس مطالبہ کا جو نتیجہ ہونا تھا، وہی ہوا، یعنی ویسرائے نے اس کو مسترد کردیا - اب گاندھی جی کیا کریں گے ؟ کونسی نئی صورت مفاہمت کی اختیار کریں گے ؟ اس کا علم شاید گاندھی جی کو بھی نہ ہوگا، کیونکہ جس روحانیت یا آسمانی قوت کے اشارہ سے وہ کسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں، اس کے پاس شاید اس سے زیادہ عجیب تجویز اور کوئی نہیں ہوسکتی

ممکن ہے کہ انفرادی طور پر ستیاہ گرہ سے کام لیا جائے اور جنگ کے خلاف تقریریں کرکرکے لوگ جیل جانا شروع کردیں، لیکن اس امکان میں بھی گاندھی جی کا اذعان حایل نظر آتا ہے

حکومت کہتی ہے کہ ایک طرف تم یہ بھی کہتے جاتے ہو کہ ہندوستان کو ہم آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور نازی حکومت کو کبھی گوارا نہیں کرسکتے، لیکن دوسری طرف برطانیہ کو فوجی مدد دینے کے خلاف اظہارِ رائے کی آزادی بھی چاہتے ہو، یہ دونوں باتیں کیونکر پوری ہوسکتی ہیں

کانگرس، حکومت کے اس اعتراض کا جواب صاف صاف نہیں دینا چاہتی، ورنہ وہ اس کے جواب میں یہ

پوچھ سکتی ہے کہ کیا برطانیہ کی شکست اس کو مستلزم ہے کہ نازی حکومت ہندوستان میں قایم ہو جائے اور کیا برطانیہ کی فتح کا لازمی نتیجہ آزادی ہندوستان ہے؟

اس وقت حکومت ہند اور کانگرس دونوں ایک دوسرے کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب تک ایک دوسرے پر اعتماد نہ ہو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر گاندھی جی کو یقین ہے کہ اس وقت ستیاگرہ کامیاب نہیں ہو سکتی تو انھیں صاف صاف کہدینا چاہئے اور مختلف بہانوں سے اس فیصلہ کو ٹالتے رہنے کی کوشش نہ کرنا چاہئے اور اگر حکومت واقعی ہندوستان کو آزادی دینا چاہتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ابھی سے اس کی داغ بیل ڈالنے کا ارادہ نہ کرے

مسلم لیگ کی روش اور زیادہ حیرت انگیز ہے۔ جب وہ یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرکے، ایک حصہ مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو جانا چاہئے اور دوسرا ہندوؤں کے لئے، تو پھر اس کو اسوقت تک حکومت سے تعاوُن نہ کرنا چاہئے، جب تک اس تقسیم کا یقین نہ ہو جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مسٹر جناح مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ کہہ رہے ہیں، ان کا تعلق صرف اکثریت و اقلیت کے جھگڑوں سے ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اگر مرکزی حکومت میں مسلم نیابت ان کی مرضی کے مطابق ہو جائے تو شاید وہ پاکستان کی تجویز کو بھی معرضِ التوا میں ڈالدیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جاپان کی موجودہ پالیسی نے ہندوستان کو بھی خطرہ سے قریب تر کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ تعاوُن کرنا ہمارے لئے مفید ہو گا یا نہیں۔ اگر ہم کو یقین ہے کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر ہم اپنی حفاظت و مدافعت کر سکتے ہیں تو خیر، ورنہ ہم کو ایسے وقت میں کوئی ایسی بحث چھیڑنا نہ کرنا چاہئے جو حکومت اور اہلِ ہند دونوں کو تذبذب کی حالت میں رکھے

یقیناً ہم کسی غیر حکومت کو یہاں نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن اگر اس کا امکان ہے کہ یہاں جاپان یا جرمنی کی حکومت قایم ہو سکتی ہے، تو پھر کوئی وجہ نہیں، کہ برطانوی حکومت کو گوارا نہ کیا جائے، جو یقیناً دوسری حکومتوں کے مقابلہ میں ہمارے مطالبات کو زیادہ رواداری کے ساتھ سُن سکتی ہے

"نگار" جنوری سنہ ۴۱ء

کے متعلق تفصیلی بیان صفحہ ۶۰ پر ملاحظہ فرمایئے۔

اُس لڑائی کے بعد اور اِس لڑائی سے پہلے

(مسلسل)

ہٹلر کا ابتدائی عروج

یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ پچھلی لڑائی کے بعد جرمنی میں جمہوریت کا قیام ہو گیا تھا، لیکن اسکی حالت بہت متزلزل تھی، مختلف جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں اور ہر ایک اپنا اقتدار چاہتی تھی انھیں میں ایک جماعت ہٹلر کی تھی جو قومی اشتراکیت کی علمبردار تھی، لیکن اس کا مقصود صرف جماعتی اقتدار قائم کرنا تھا۔

مئی سنہ ۲۸ء سے مارچ سنہ ۳۳ء تک پانچ مرتبہ انتخاب عمل میں آئے اور ہر بار نازی جماعت نے اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے آسمان و زمین ایک کر دیا۔ نازی جماعت کی مخالفت سب سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے ہو رہی تھی اور ہٹلر اسی پارٹی کے توڑنے کی فکر میں تھا۔ نازی پارٹی نے ملک کو کمیونسٹ جماعت کی طرف سے بدظن کرنے کے لئے رشتاگ میں آگ لگا دی اور الزام رکھا کمیونسٹ لوگوں پر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر کو زیادہ ووٹ مل گئے اور حکومت کا بایاں بازو بالکل کمزور ہو گیا۔

نازی پارٹی نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد گشتاپو کے ذریعہ سے تمام مخالف لوگوں کو پکڑ پکڑ کر ہلاک کرنا شروع کیا، اور اپنی آہنی گرفت سے جابرانہ تسلط قائم کرنے میں اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔

پھر جرمنی کا یہ انقلاب کوئی معمولی بات نہ تھی جس سے دول یوروپ متاثر نہ ہوتے، لیکن انھوں نے زیادہ دور رس نگاہ سے کام نہیں لیا اور نازی حکومت کے خلاف کوئی ایسی متحدہ پالیسی قائم نہیں کی جو اس خطرہ کو زیادہ وسیع نہ ہونے دیتی۔

برطانیہ میں ہٹلر کے خلاف بجائے غصہ کے ہمدردی کے جذبات پیدا تھے۔ لندن کے دولتمند لوگ اسکو روپیہ قرض دینا چاہتے تھے، بعض کا خیال تھا کہ اگر دوسرے ملکوں کی قربانی چڑھا کر ہٹلر کو خوش کیا جا سکتا ہے تو بھی کوئی حرج نہیں۔ ایک جماعت کھلم کھلا، برطانیہ و جرمنی اتحاد کی حامی تھی اور نیول چمبرلین کو اپنے والد کی رائے یاد آ رہی تھی جس میں صاف صاف ظاہر کیا گیا تھا کہ:۔

"اگر جرمنی سے ہمارا اتحاد ہو جائے تو ہم دُنیا کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیں اور پھر کسی کو امن شکنی کی جرأت نہ ہو۔"

ہم فرانسیسیوں سے بگاڑنا نہیں چاہتے، لیکن جرمنی والوں کی طرح ان میں جوش و ولولہ کہاں۔

ہم زیکو اور پولستان کے لوگوں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ جرمنی کو اس کی مطلوبہ رعایتیں دیدیں، ورنہ نتیجہ ان کے خلاف ہوگا، اگر جرمنی مشرقی یوروپ میں بڑھنا چاہتا ہے تو بڑھے ہم سے کیا واسطہ، اچھا ہے اسکی قوتیں اُسی طرف صرف ہوں، ہمارے لئے مشرقی یوروپ کے بازاروں کو سنبھالنا زیادہ فایدہ مند نہیں۔ رہا جرمن نوآبادیوں کا مسئلہ، سو اس کے لئے ہم چندہ کی فہرست کھلوادیں گے تاکہ افریقہ میں اس کی نوآبادیاتی سلطنت قایم ہوجائے۔ اس فہرست میں سب سے پہلے ہمارا اور فرانس کا نام ہوگا لیکن ہمیں بلجیم، پرتگال اور جنوبی افریقہ والوں سے بھی امید ہے کہ وہ کافی مدد کریں گے۔

محکمۂ خارجہ کے لوگ خواہ مخواہ سیدھی سادی باتوں کو اُلجھاوے میں ڈالدیتے ہیں۔ برطانیہ کی خارجہ پالیسی کا صرف ایک مقصد ہونا چاہئے اور وہ یہ کہ جرمنی سے دوستی پیدا کی جائے۔"

یہ تھا خیال برطانیہ کے بعض بڑے بڑے آدمیوں کا جس کا سلسلہ برابر سنہ ۳۸ء تک جاری رہا۔ بعض نے اس کی مخالفت میں کہا کہ جرمنی سے اتحاد پیدا کرنے کی جگہ اس کی راہ میں متحدہ سلافی ریاستوں کی دیوار قایم کردینا چاہئے تاکہ وہ مغرب کی طرف نہ بڑھ سکے، لیکن اسے کسی نے نہ سُنا۔ البتہ طبقۂ عمال اور ٹریڈ یونین کے لیڈر ضرور نازیوں کے مخالف تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جرمنی میں نازی حکومت نے طبقۂ عمال کی آزادی چھین لی ہے اور تجارت پیشہ لوگوں کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ لیکن برطانیہ کی نرم پالیسی والے لوگ ان باتوں کو نہ سمجھتے تھے، وہ برابر یہی کہتے آرہے تھے کہ جرمنی سے جنگ کرنا تہذیب کو ختم کردیتا ہے۔

الغرض یہ تھی برطانیہ کی پالیسی جب ہٹلر برسرِ اقتدار ہوا اور جس سے فایدہ اُٹھا کر اس نے اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کردیا۔

۱۷ مئی سنہ ۳۳ء کو ہٹلر نے ریشتاگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"جرمنی اُن راہوں سے ہٹنا پسند نہیں کرتا جو صلح کے معاہدات نے متعین کردی ہیں اور ہم کسی ملک پر حملہ کرنا نہیں چاہتے۔"

لیکن اُسی صبح کو ڈاکٹر راشننگ (Dr Rauschning) سے ہٹلر یہ گفتگو کرچکا تھا کہ:

"میں ہر معاہدہ کے لئے طیار ہوں، ہر صلحنامہ پر دستخط کردوں گا، لیکن میں جانتا ہوں کہ ایک دن یہ سب معاہدے کردیں گے۔"

ہٹلر مسلح ہوتا ہے

سنہ ۳۳ء میں برطانیہ کی مختلف پارٹیوں کے درمیان یہ بحث شروع ہوئی کہ غیر مسلح بنانے والی کانفرنس (Disarmament-Conference) میں برطانیہ کی پالیسی کیا ہونا

چاہئے، لیکن یہ گفتگو کسی خاص نتیجہ تک نہ پہونچ سکی۔ بعض کا خیال تھا کہ جرمنی کو مسلح ہوجانے کی اجازت ضرور دینا چاہئے تاکہ فرانس دبا رہے، بعض اس کے مخالف تھے۔ آرتھر ہنڈرسن (وزیر خارجہ اور کانفرنس کے صدر) تخفیف اسلحہ کے قایل ضرور تھے لیکن ایک متعین و محدود صورت میں۔

جب سنہ ۳۲ء میں یہ کانفرنس جنیوا میں منعقد ہوئی تو بم برسانے والے جہازوں کو تو یقیناً ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جاتا اور ایک بین الاقوامی ہوائی پولیس کے سپرد اس کی نگرانی ہوجاتی، لیکن برطانیہ نے اس کی مخالفت کی کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو ایسے جہازوں سے محروم کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بم برسانے والے جہاز رکھنے کی اجازت تمام ملکوں کو دیدی گئی اور ہٹلر نے اپنی چانسلری کی ابتدا ہی میں گورنگ کو حکم دیدیا کہ ساری توجہ ہوائی طاقت بڑھانے پر صرف کی جائے، جسکی اطلاع وقتاً فوقتاً برطانوی پارلیمنٹ کو پہونچتی رہتی تھی لیکن وہ اس کو شکر ٹال جاتے تھے یہاں تک کہ مسٹر بالڈون نے نومبر سنہ ۳۴ء میں اس کا اعتراف کیا بھی تو ان کمزور الفاظ میں کہ "واقعی جرمنی اپنی ہوائی طاقت بڑھا رہا ہے"، درانحالیکہ اسوقت تک اس کی فضائی قوت خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ چکی تھی۔

اس کے بعد جب سنہ ۳۵ء میں سرجان سائمن اور مسٹر ایڈن نے خود برلن جاکر حالات کا مطالعہ کیا تو اسوقت بھی وہ یہی خیال لیکر آئے کہ برطانیہ کی ہوائی طاقت ہنوز بڑھی ہوئی ہے۔ یہ مغالطہ کیوں ہوا۔ اس قسم کی غلط اطلاعات کیوں پہونچائی گئیں، اس کا کوئی صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا، لیکن یہ ضرور معلوم ہے کہ برطانیہ کی نرم پالیسی رکھنے والے اسی قسم کی خبریں سننا پسند کرتے تھے اور ان پر یقین کرلینے کے لئے ہر وقت طیار رہتے تھے۔

آخرکار ۱۴ اکتوبر سنہ ۳۳ء کو جرمنی غیر مسلح کرنے والی کانفرنس سے علحدہ ہوگیا اور جمعیت اقوام سے استعفا دینے کا نوٹس بھی دیدیا اور اس کے بعد ہی اس نے نہایت زور شور سے فوجی طیاریاں شروع کردیں اور سنہ ۳۳ء سے لیکر سنہ ۳۶ء تک فوجی آراستگی پر ۲۷۰۰۰ ملین پونڈ صرف کردئے، گویا برطانیہ نے سنہ ۲۴ء سے لیکر سنہ ۳۵ء تک گیارہ سال میں جتنا صرف کیا اس سے دوچند جرمنی نے صرف تین سال میں صرف کردیا یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ برطانیہ نے جتنا سولہ سال میں صرف کیا تھا اس سے زیادہ جرمنی نے تین سال کے اندر صرف کیا۔ دُنیا کی تاریخ میں یہ بالکل پہلی مثال تھی کہ کسی ملک نے اتنی قلیل مدت میں اتنی بڑی رقم فوجی آراستگی پر صرف کی ہو۔

۱۲ نومبر سنہ ۳۶ء کو مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں جو تقریر کی وہ سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

"سنہ ۳۳ء میں، میرے دوست پریشان تھے کہ یورپ میں یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ زمانہ وہ تھا جب غیر مسلح بنانے والی کانفرنس کے اجلاس جنیوا میں ہو رہے تھے اور برطانیہ میں صلح کن پالیسی کا یہ زور تھا کہ ایک ممبر سات ہزار ووٹ سے صرف اس لئے ہار گیا کہ اس کی پالیسی اس کے خلاف تھی۔ پھر غور کیجئے کہ اگر ایک پارٹی کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے میں ملک کو یہ خبر سناتا کہ جرمنی دوبارہ مسلح ہو رہا ہے اور ہمیں بھی اُس کے مقابلہ میں مسلح ہونا چاہئے تو

اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ میں شاید بہت زیادہ ووٹوں سے ہار جاتا"

آپ نے دیکھا کہ برطانیہ کا وزیر اعظم صرف اس ڈر سے کہ مبادا اس کا انتخاب نہ ہو سکے زمانہ کی رو میں بہ جاتا ہے اور آنے والے خطرہ کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔

۹ر دسمبر سنہ ۳۸ء کو مسٹر چرچل نے ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ:

"میں نے سنہ ۳۴ء ہی میں مسٹر بالڈون کو مطلع کر دیا تھا کہ جرمنی خفیہ طور پر ہوائی طاقت بہت بڑھا رہا ہے، لیکن اسکو باور نہ کیا گیا، لیکن چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ مسٹر بالڈون کو اپنی غلطی تسلیم کرنا پڑی، لیکن ان کے بعد مسٹر چمبرلین کی وزارت شروع ہوئی جن کی قوت فیصلہ، بالڈون سے زیادہ کمزور تھی اور آج ہم اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں"

چنانچہ مسٹر ڈالٹن کے ایک دوست نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ بالڈون اور چمبرلین دونوں ایک سے ہیں اور دونوں کو اس جرم میں پکڑنا چاہئے کہ انھوں نے سلطنت برطانیہ کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

ہٹلر کے ابتدائی اقدامات

جب ہٹلر نے دول یورپ کی کمزور پالیسی سے فایدہ اُٹھا کر رفتہ رفتہ اپنے آپ کو مضبوط کر لیا تو جنوری سنہ ۳۵ء سے ستمبر سنہ ۳۸ء تک اس نے پانچ اقدامات کئے ایک سار کے علاقہ میں، دوسرا رہائن لینڈ میں، تیسرا اسپین میں، چوتھا آسٹریا اور پانچواں سوڈیٹن لینڈ کی طرف۔

بعض علاقوں میں ان اقدامات کا عذر یہ پیش کیا گیا کہ یہاں کی جرمن آبادی کو اصولاً رائش سے وابستہ ہونا چاہئے۔ بعض جگہ جرمنی زمین کی حفاظت کا عذر پیش کیا گیا اور کہیں یہ کہ بالشویت کا مقابلہ ہے۔

سار

معاہدۂ ورسائی کی رو سے جنوری سنہ ۳۵ء میں سار کے لوگوں کی رائے طلب کی گئی کہ وہ جرمنی میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں اور کثرت رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ اس علاقہ کو جرمنی میں شامل ہونا چاہئے جو بالکل حق بجانب تھا لیکن رہائن لینڈ میں کیا ہوا۔ یہ داستان سننے کے قابل ہے

رہائن لینڈ

عہد نامۂ ورسائی کی رو سے طے پایا تھا کہ رہائن لینڈ پر پندرہ سال تک برطانیہ، فرانس اور بلجیم کی فوجوں کا قبضہ رہے گا اور اگر جرمنی نے صلحنامہ کے معاہدات کی پابندی نہ کی تو اس سے بھی زیادہ عرصہ تک اور پھر اس علاقہ کو ہمیشہ کے لئے غیر مسلح کر دیا جائے گا جیسے سنہ ۲۵ء میں معاہدۂ لوکارنو کے مطابق جرمنی نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔

چنانچہ جون سنہ ۳۰ء ہی میں (پندرہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی) تمام فوجیں یہاں سے چلی گئیں۔ جب سنہ ۳۳ء میں ہٹلر برسر عروج ہوا تو اس تخلیہ کو تین سال کا زمانہ گزر چکا تھا، لیکن یہ بالکل خاموش رہا اور ہمیشہ یہی کہا کہ وہ معاہدۂ لوکارنو توڑنا پسند نہیں کرتا۔ جب ۲ر مئی سنہ ۳۵ء کو فرانس اور سودیٹ حکومت کے درمیان معاہدہ اتحاد ہوا، تو ہٹلر نے اس وقت بھی کچھ نہیں کہا، حالانکہ اُصولاً وہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا تھا۔ ۲۱ر مئی کو ریشتاگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"جرمن حکومت معاہدہ لوکارنو کی لفظ بلفظ پابندی کرے گی اگر دوسری حکومتوں نے بھی اس کا لحاظ کیا"

یہ نہایت ہلکا سا اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ فرانس نے سوویٹ حکومت سے اتحاد کرکے معاہدۂ لوکارنو کی خلاف ورزی کی ہے، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، بلکہ آسٹریا کی بابت بھی اس نے صاف صاف کہدیا کہ وہ اس پر قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ وہ وقت تھا جب اطالوی فوجیں آسٹریا کی سرحد پر مجتمع تھیں اور اسٹریسا (Stresa) کے محاذ پر فرانس و برطانیہ کی فوجوں کا اجتماع کیا جاتا تھا۔

اس کے دس ماہ بعد جب فرانس و برطانیہ کی فوجیں اٹلی کے حملۂ حبشہ کے سلسلہ میں نام نہاد ناکہ بندی کی غرض سے ہٹالی گئیں اور برطانیہ و اطالیہ کے تعلقات بھی ناخوشگوار ہو گئے تو، ۷ مارچ سنہ ۳۶ء کو ہٹلر نے رہائن لینڈ پر قبضہ کر لیا اور بہانہ یہ پیش کیا کہ فرانس پہلے ہی سوویٹ حکومت سے اتحاد پیدا کرکے عہدنامۂ لوکارنو کی خلاف ورزی کر چکا تھا اس لئے اب وہ بھی اس کی پابندی نہیں کرتا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا کہ وہ یوروپ کے امن و سکون کو تباہ کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے — برطانیہ کے امن پسند لوگ یہ سنکر خوش ہو گئے اور انھوں نے کہنا شروع کیا کہ رہائن لینڈ پر اگر جرمنی نے قبضہ کر لیا تو کیا گناہ کیا۔ کیا یہ اس کا علاقہ نہ تھا اور کیا یہ مناسب تھا کہ اسے واپس نہ دیا جاتا۔

ہٹلر سمجھتا تھا کہ قبضۂ رہائن لینڈ پر ضرور کوئی نہ کوئی جھگڑا پیدا ہوگا، لیکن جب اس نے فوراً ہی وہاں کی قلعہ بندیاں شروع کر دیں اور اٹلی کو اپنی طرف مایل کرکے روم برلن محور (Rome Berlin axis) قایم کر لیا اور ایک نئے زاویہ سے اس نے فرانس و انگلستان پر دباؤ ڈالنے کی تدبیر شروع کر دی۔

فرانس اور سوویٹ اتحاد کے مسئلہ میں اس سے کہا گیا کہ اگر وہ چاہے تو بین الاقوامی عدالت کے ذریعہ سے اس امر کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ فرانس اور سوویٹ حکومت کا یہ اتحاد حسب معاہدۂ لوکارنو درست ہے یا نہیں، لیکن ہٹلر نے جواب دیدیا کہ "جرمنی کسی بین الاقوامی عدالت کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرنا نہیں چاہتا"

اسپین سنہ ۳۶ء کے موسم گرما میں اسپین کے اندر خانہ جنگی رونما ہوئی اور ہٹلر و مسولینی دونوں نے باغی جماعت کی مدد کی روس نے وہاں کی اصل جمہوری حکومت کا ساتھ دیا لیکن بہت دبے دبے۔ فرانس و برطانیہ نے کوئی دخل نہیں دیا اس ڈر سے کہ کہیں دوسری جنگ عظیم نہ چھڑ جائے۔

فرانس و برطانیہ نے اس باب میں اتنی احتیاط سے کام لیا کہ اپنے یہاں سے اسلحہ وغیرہ کی برآمد بھی روک دی حالانکہ یہ کوئی ناجائز فعل نہ تھا اور نہ اس سے جنگ عظیم برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ہٹلر و مسولینی اپنی مداخلت کے لئے یہ بہانہ پیش کر رہے تھے کہ وہ جنرل فرانکو کو مدد دیکر گویا "بالشویت" سے جنگ کر رہے ہیں، حالانکہ اسوقت روس کے ساتھ حکومت اسپین کے سیاسی تعلقات بالکل نہ پائے جاتے تھے اور برطانوی مدبرین یہ سنکر خوش ہو رہے تھے کہ "اچھا ہے، بالشویت کے خلاف کسی کو جنگ کرنے کی توفیق تو ہو"

اسپین میں خانہ جنگی ڈھائی سال تک جاری رہی اور جنرل فرانکو کی کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس تین طرف سے گھر گیا۔

اور اس کا شمالی افریقہ کا بحری راستہ بھی خطرناک ہوگیا، اسی کے ساتھ برطانیہ کے لئے بحرِ روم میں کافی خطرات پیدا ہوگئے اور اشتراکیت کے خلاف اٹلی، جرمنی اور جاپان میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ اب برطانیہ، فرانس اور جمہوریت کے خلاف استعمال ہونے لگا۔ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران میں ہٹلر نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ وہاں کی جمہوری حکومت اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کردے، اور جب اسپین کے ایک ہوائی جہاز نے غلطی سے جرمنی کے جنگی جہاز پر بم گرایا تو یہ خیال اور قوی ہوگیا، لیکن خیر یہ بات ٹل گئی۔

اسوقت برطانیہ کی پالیسی یہی تھی کہ ہٹلر کو مشتعل ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے یہاں تک کہ جب زیکوسلیویکیا پر ہٹلر نے حملہ کا ارادہ کیا تو اسوقت بھی، مسٹر چیمبرلین نے برطانوی بیڑوں کی نقل و حرکت کی اجازت نہیں دی۔ الغرض سنہ ۳۷ء کے اخیر تک لندن میں ایک عام خیال یہی موجزن تھا کہ جرمنی کے ساتھ رعایت و مروت سے کام لیا جائے اور اسکو جنگ پر آمادہ نہ ہونے دیا جائے۔ یہاں تک کہ برطانیہ افریقہ کی بعض نوآبادیاں بھی کچھ اور اضافہ کے ساتھ جرمنی کو واپس دینے کے لئے طیار تھا۔

آسٹریا اُس طرف برطانیہ کی یہ صلح کُل پالیسی کام کر رہی تھی اور اِدھر ہٹلر وسط یوروپ کا آیندہ نقشہ طیار کر رہا تھا۔ اس نے ۱۱ر جولائی سنہ ۳۶ء کو آسٹریا سے معاہدہ کرکے اس کی حکومت کو تسلیم کیا، پھر ۱۲ر فروری سنہ ۳۸ء کو اس کی توثیق بھی کی لیکن ۱۰ر مارچ سنہ ۳۸ء کی صبح کو اپنی فوجیں اُتار کر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر قبضہ کرلیا۔ بہانہ یہ تھا کہ آسٹریا کا چانسلر اس فکر میں تھا کہ اُسے جرمنی سے بالکل علحدہ کرکے خود مختار بنادے۔

اس واقعہ کو بھی برطانوی امن پسندوں نے دیکھا اور کہا کہ "آسٹریا میں چونکہ جرمن آبادی ہے، اس لئے جرمن حکومت سے اس کا علحدہ رہنا کوئی معنی نہ رکھتا تھا، اور جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا"

روسی حکومت نے جو سمجھتی تھی کہ اب زیکوسلیویکیا کی باری ہے، البتہ اس کو پسند نہیں کیا اور ایک کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی تاکہ تمام بڑی چھوٹی قوتیں ملکر آیندہ اس قسم کے جرمنی اقدامات کو روک دیں۔ لیکن برطانیہ نے اس تحریک کی مخالفت کی اور مسٹر چیمبرلین نے کہا کہ "سوویٹ حکومت کی اس تجویز پر عمل کرنا ایک ایسے خطرہ کے متعلق عملی قدم اٹھانا ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا"

قبضۂ آسٹریا کے بعد زیکوسلیویکیا چاروں طرف جرمن حکومت سے گھر گیا تھا لیکن ہٹلر برابر اسے بھلاوے میں ڈالے ہوئے تھا اور اس کی دوستی کا دم بھر رہا تھا، چنانچہ ۱۴ر مارچ سنہ ۳۸ء کو مسٹر چیمبرلین نے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"مجھے فیلڈ مارشل گورنگ نے اطلاع دی ہے کہ جرمنی، زیکوسلیویکیا سے بگاڑ ناپسند نہیں کرتا اور معاہدۂ اتحاد کا پورا احترام کرتا ہے"

لیکن جب چھ مہینے کے بعد زیکوسلیوکیا کے حصے بخرے کئے جانے کی تجویز پر اس نے اس معاہدۂ اتحاد کی طرف برطانیہ و فرانس کو توجہ دلائی تو انھوں نے اس کو تضیع اوقات سمجھا۔

معاہدۂ میونک۔

۳۰ر اور ۳۱ر مئی ۳۸ء کو ہٹلر زیکوسلیوکیا پر حملہ کر ہی دیتا اگر سرحد پر زیکی فوجوں کا اجتماع نہ ہو گیا ہوتا اور فرانس و برطانیہ کی طرف سے تنبیہی نوٹ نہ پہونچ گیا ہوتا۔ لیکن اندرونی طور پر جو صورت حال تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۰ر مئی کو ایک دعوت کی تقریب میں مسٹر چیمبرلین کہہ چکے تھے کہ

"فرانس، برطانیہ اور روس، زیکوسلیوکیا کی طرف سے نہیں لڑ سکتے کیونکہ اس کی موجودہ جغرافی حیثیت کسی طرح باقی نہیں رہ سکتی اور اس پر نظر ثانی ضروری ہے"

ربن ٹراپ، ہٹلر سے کہا کرتا تھا کہ میرے تعلقات اکابر برطانیہ سے اس بات کی ضمانت ہیں کہ وہ زیکوسلیوکیا کی مدد نہ کریں گے، اس لئے ظاہر ہے کہ جب مسٹر چیمبرلین کی یہ تقریر اس نے اخبارات میں دیکھی ہوگی تو اس کو ربن ٹراپ کی باتوں کا اور زیادہ یقین ہو گیا ہوگا۔

اس کے بعد گرمی کا زمانہ جوں جوں ختم ہوتا گیا "سوڈیٹن لینڈ" میں انقلابی جذبات کو زیادہ ابھارا گیا اور سوڈیٹن کے لیڈروں نے زیکی حکومت کی تمام تجاویز کو یکے بعد دیگرے مسترد کر دیا، یہاں تک کہ جرمن افواج زیکستان کی سرحد پر جمع ہونے لگیں۔ جب حالات اس قدر نازک ہو گئے تو مسٹر چیمبرلین تین بار ہوائی جہاز پر سوار ہو کر ہٹلر سے ملنے گئے، پہلی مرتبہ (Berchtesgaden) میں دوسری مرتبہ (Godesberg) میں اور آخری مرتبہ میونک (Munich) میں۔ ہر چند بائیں بازو نے دوبار اصرار کیا کہ پارلیمنٹ کا جلسہ طلب کیا جائے اور اس سے مشورہ لیا جائے، لیکن چیمبرلین نے انکار کر دیا اور یہ جلسہ طلب کیا بھی تو اس وقت جب وہ میونک کو روانہ ہونے والے تھے۔ اس کے بعد ۳ر اکتوبر کو پارلیمنٹ میں چار دن تک گفتگو ہوتی رہی لیکن بیکار کیونکہ معاہدۂ میونک کی غلطی ہو چکی تھی اور اس کا علاج ممکن نہ تھا۔

مسٹر چیمبرلین سیاست خارجہ کا زیادہ تجربہ نہ رکھتے تھے اور اُن کے مشیر بھی ناتجربہ کار تھے۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ وہ ہٹلر سے ملنے گئے تو نہ فارن سکریٹری کو ساتھ لے گئے اور نہ کسی مترجم کو۔ وہ خود جرمن زبان جانتے نہیں اس لئے انھیں صرف اس مترجم پر بھروسہ کرنا پڑا جو ہٹلر کی طرف سے متعین کیا گیا تھا۔

لیبر پارٹی کی پالیسی بالکل کھلی ہوئی تھی اور اس نے صاف صاف کہدیا تھا کہ جرمنی کے خلاف فرانس، برطانیہ اور روس کو متحد ہو جانا چاہئے اور زیکوسلیوکیا کی طرف بڑھنے سے جرمن کو قطعاً روک دینا چاہئے کیونکہ اب ہٹلر کے ارادے بالکل واضح ہو چکے ہیں، لیکن مسٹر چیمبرلین نے اس کی پرواہ نہ کی۔

جب چیمبرلین، ہٹلر سے مل کر پہلی مرتبہ واپس ہوئے تو وہ بہت خوش تھے اور ہٹلر کے وعدوں پر انھیں پورا بھروسہ تھا لیکن اس سے زیادہ غلطی برطانوی وزارت نے روس کے ساتھ معاملہ کرنے میں کی۔

چونکہ زیکستان میں ایک کرور سلافی آبادی پائی جاتی ہے اس لئے روس کو قدرتاً اس مسئلہ میں دلچسپی لینا چاہئے تھی، لیکن میونک میں اس کے نمایندہ کو صرف اس لئے نہیں بلایا گیا کہ ہٹلر اور مسولینی اس کو پسند نہ کریں گے۔ درانحالیکہ پرائویٹ طور پر یہ معلوم ہو چکا تھا کہ زیکستان کے باب میں وہ فرانس کے ساتھ جرمنی کے خلاف جنگ کرنے پر پوری طرح آمادہ ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور تماشہ کی بات یہ ہوئی کہ میونک کانفرنس میں زیکستان کا بھی کوئی نمایندہ طلب نہیں کیا گیا حالانکہ اسکے حصے بخرے کئے جا رہے تھے۔

ہٹلر کی اول ملاقات کے بعد فرانس و برطانیہ کی طرف سے زیکی حکومت کو اطلاع دی گئی کہ جن مقامات میں ۵۰ فیصدی سے زیادہ آبادی جرمنوں کی ہے وہ فوراً جرمنی کے حوالہ کر دئے جائیں۔ اس کا زیکی حکومت نے نہایت معقول جواب دیا کہ اس معاملہ کو اس معاہدہ کی رُو سے طے کیا جائے جو جرمنی اور زیکی حکومت کے درمیان سنہ ۲۶ء میں ہوا تھا اور جس کی تصدیق مارچ سنہ ۳۸ء میں بھی ہٹلر نے کی تھی۔ لیکن ۲۱ ستمبر ۲ بجے شب کے وقت دفعتاً اتحادی وزراء وہاں پہونچے اور کہا کہ اگر زیکی حکومت نے انکی تجویز پر عمل نہ کیا تو نتیجہ کی ذمہ دار وہ خود ہوگی اور اتحادی اس کی مدد نہ کریں گے۔ آخرکار اسی دن سہ پہر کو زیکی حکومت نے اتحادی تجاویز تسلیم کر لئے۔

لیکن ہٹلر نے اس کے بعد اپنے شرائط اور زیادہ سخت کر کے الٹی میٹم دیدیا۔ اتحادیین نے ان شرائط کے ماننے سے یونتو انکار کر دیا اور فوجی اجتماع ہونے لگا۔ لیکن جب چیمبرلین اور ڈلیڈیر (فرانس کے وزیر اعظم) میونک گئے تو جرمنی کے ان تمام شرائط کو تسلیم کر آئے جو فی الحقیقت پہلی شرطوں سے بھی زیادہ سخت تھیں اور مسٹر چیمبرلین نے ۲۸ ستمبر کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "ہٹلر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ زیکستان کے بعد وہ اب کسی اور ملک کی طرف اقدام نہ کرے گا اور میں اس کے وعدہ پر بھروسہ کرتا ہوں"۔

کہا جاتا ہے کہ اگر اسوقت اتحادیین مضبوطی و پامردی سے کام لیتے تو ہٹلر دب جاتا اور کبھی زیکستان پر حملہ نہ کرتا، لیکن مسٹر چیمبرلین کی امن پسند پالیسی نے ہٹلر کی دھونس میں آکر موجودہ جنگ کی تباہی میں مبتلا کر دیا، چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ جسوقت مسٹر چیمبرلین میونک سے واپس گئے تو رِبن ٹراپ نے ہٹلر سے کہا کہ "آج اس بڈھے نے برطانوی حکومت کی موت کے کاغذ پر دستخط کر دئے اور تاریخ متعین کرنا ہمارے لئے چھوڑ دیا ہے"۔

لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ہٹلر اتحادیین کی بات نہ مانتا اور زیکستان کے لئے لڑ بیٹھتا تو بھی سنہ ۳۸ء اس جنگ کے لئے زیادہ موزوں تھا اور سنہ ۳۹ء میں حالات اتحادیین کے لئے بہت ناموافق ہو گئے تھے۔

ستمبر سنہ ۳۸ء میں اٹلی کا کوئی ارادہ نہ تھا کہ وہ جرمنی کا ساتھ دے اور اسی لئے اس نے فوجی طیاریاں بالکل کی تھیں، لیکن سنہ ۳۹ء میں اس کی مدد بھی ہٹلر کو مل گئی۔

سنہ ۳۸ء میں زیکستان کی تمام فوج اور اس کی قلعہ بندیاں اور وہاں کے اسلحہ سازی کے جملہ کارخانے اتحادیین

کی مدد کے لئے موجود تھے، لیکن ۳۹ء میں زیکستان پر قبضہ کرنے کے بعد وہاں کے تمام ذرائع ہٹلر کے ہاتھ آ گئے تھے جن سے نازی افواج کو بڑی تقویت حاصل ہو گئی تھی۔

۳۸ء میں اتحادیین کو روسی امداد بھی مل سکتی تھی، لیکن ۳۹ء میں روس کا میلان جرمنی کی طرف ہو گیا۔

۳۸ء میں پولینڈ کی مدد بھی حاصل ہو سکتی تھی، کیونکہ روس اس کو جرمنی کی طرف مائل ہونے سے روک سکتا تھا، لیکن ۳۹ء میں روس کے طرزِ عمل سے یہ حالات بالکل بدل گئے اور پولینڈ خود عذاب میں مبتلا ہو گیا۔

۳۸ء میں اس کا بھی امکان تھا کہ بلقان کی اکثر ریاستیں بجائے غیر جانبدار رہنے کے اتحادیین کا ساتھ دینے پر مائل ہو جاتیں، لیکن ۳۹ء میں یہ اخلاقی مدد بھی اتحادیین کو حاصل نہ ہو سکی۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ اگر زیکستان کی حمایت میں اتحادیین اُٹھ بیٹھتے اور یہ جنگ ۳۸ء ہی میں شروع ہو جاتی تو نازی کامیابی دشوار تھی، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ اُسوقت اتحادیین کی ہوائی طاقت نسبتاً کم تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک حد تک یہ عذر معقول ہو، لیکن اب سے دو سال قبل جرمنی کی ہوائی طاقت بھی اتنی قوی نہ تھی، علاوہ اس کے سیگفرڈ لائن اتنی کمزور تھی کہ وہ فرانسیسی حملہ کو کسی طرح نہ روک سکتی تھی۔

اس باب میں مسٹر چرچل کا نقطۂ نظر شروع ہی سے چیمبرلین کے زاویۂ نگاہ سے مختلف رہا ہے۔ چنانچہ ۹ دسمبر ۳۸ء کو اپنی تقریر کے دوران میں انھوں نے ہٹلر کی جارحانہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہدیا تھا کہ اس کے ساتھ جس نرمی کا سلوک کیا گیا وہ ہرگز اس کا مستحق نہ تھا اور اس کے کسی وعدہ پر اعتبار نہ کرنا چاہئے تھا۔

(باقی)

طلسمِ عمل

اُردو زبان میں پہلی کتاب جس میں "نفسیات" کے اس راز کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان کیونکر کامیاب زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ہے مسٹر ڈیل کارینگی کی اس مشہور کتاب کا جو شایع ہوتے ہی لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو گئی۔

ترجمہ اس قدر سلیس و سادہ ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ مصنف نے اپنے تجربات و مشاہدات کے ذریعہ سے نفسیاتی حقایق کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک افسانہ کی دلچسپی اس میں پیدا ہو گئی ہے۔ کتاب کو ایکبار شروع کرنا اسے ختم کر دینا ہے۔

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

شہرت کا عام دربار

کل رات بڑی دیر تک نیند نہ آئی بیسیوں پہلو بدلے جتنی خواب آور دعائیں یاد تھیں سب پڑھ ڈالیں مگر نیند نہ آنا تھا نہ آئی آخر جب تنگ آگیا اور کوئی تدبیر سونے کی کارگر نہ ہوئی تو کتاب دیکھنے کی ٹھانی کچھ تو اس خیال سے کہ بیکار پڑے رہنے سے کیا فایدہ اور کچھ اس خیال سے کہ حکیموں نے مطالعۂ کتب کو خواب آور کہا ہے۔ سرہانے کی الماری سے بیٹھے لیٹے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب نکالی، اور پاس ہی رکھے ہوئے برقی لیمپ کا بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ کتاب پر نظر پڑی تو آزاد کی نیرنگ خیال، اور صفحہ جو کھولا تو وہ جہاں آزاد اپنے اُستاد ذوق کے لئے بقائے دوام کے دربار میں کرسی ڈھونڈ رہے تھے۔ میں بھی تماشا دیکھنے لگا، بقائے دوام کے دربار میں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، اور آزاد انھیں قرینہ سے بٹھا رہے تھے۔ آخر وہ وقت آیا کہ خیمہ مستحقین سے بھر گیا اور پچھلی صف میں دو ایک کرسیاں خالی رہ گئیں۔ کچھ لوگوں نے آزاد کی محنت کے صلہ میں انھیں بھی ایک کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن فوراً اعتراضات شروع ہوئے کسی نے کہا کہ اس نے "ایک عالم سے لڑائی مول لے رکھی ہے" کسی نے کہا کہ "ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے" وغیرہ وغیرہ غرض اس ہڑبونگ میں آزاد کھسک گئے، کچھ دیر کے بعد جب ذرا سکون ہوا اور میں نے بقائے دوام کے دربار کی طرف نگاہ اُٹھائی تو نہ وہ خیمہ تھا، نہ وہ شہنائی کی آواز تھی اس کی جگہ ایک بڑا وسیع پنڈال برقی قمقموں اور کاغذ کی جھنڈیوں سے آراستہ نظر آیا، پنڈال کے قریب ہی ایک جھیل تھی جس میں کچھ کشتیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پر سے بینڈ کی آواز آرہی تھی، پنڈال کے دروازے پر برقی قمقموں سے "خوش آمدید" بنا ہوا لگا تھا۔ اور کچھ حضرات مغربی لباس میں آنے والوں کو خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑے تھے، لیکن یہ عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ ہر آنے والے سے اندر جانے کے لئے دعوت نامہ طلب کیا جاتا ہے اور جس شخص کے پاس کارڈ موجود نہیں ہوتا اسکی جیب کی تلاشی لیجاتی ہے اگر کچھ مال قابل قدر مل گیا، تو انھیں بھی ٹکٹ دیدیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص پنڈال میں داخل ہوجاتا ہے تو اس کا نام بذریعہ لاؤڈ اسپیکر مع اس کے چند کارناموں کے سنا دیا جاتا ہے اور وہ شخص اپنا ٹکٹ لئے لال ٹول کے ڈھکے ہوئے راستہ سے شہ نشین تک جاتا ہے اور صدر کو انگریزی طریقے سے سلام کرتا ہوا چبوترے کے دائیں یا بائیں جانب سے نکلتا ہوا مقررہ جگہ پر جو اس کے ٹکٹ میں لکھ دی جاتی ہے آکر بیٹھ جاتا ہے

مجھ کو یہ حیرت ہوئی کہ آخر یہ کہاں کا دربار ہے جو اس قسم کی انوکھی پابندیاں عاید ہیں، پنڈال کے دروازے کو میں غور سے دیکھا تو سائین بورڈ میں، وہی "بقائے دوام" "شہرت عام کا دربار" جگمگا رہا تھا۔ دروازے پر جانے کی تو ہمت

نہ پڑی کیونکہ نہ تو دعوت نامہ پاس تھا اور نہ جیب میں پیسے البتہ ایک جگہ پنڈال کی قنات ذرا سی کھلی تھی اور روشنی باہر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں ادھر چلا گیا اور اندر جھانکنے لگا، دیکھتا کیا ہوں کہ شہ نشین پر بڑا لانبا چوڑا ایرانی قالین بچھا ہوا ہے اس پر نہایت اعلیٰ درجہ کی میز بچھی ہوئی ہے جس پر کمخواب کا میز پوش پڑا ہوا ہے اور لٹکے تین کونوں پر "بقائے دوام، شہرت عام اور محنت کا انجام" کڑھا ہوا تھا۔ چوتھا کونہ چونکہ نظر سے غائب تھا اس لئے پڑھا نہ جا سکا۔ میز پر ایک چھوٹا سا مائی کروفون رکھا ہوا تھا۔ میز کے قریب ایک گنگا جمنی گدے دار کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھا کہ کرسی پر جو شخص متمکن ہے وہ آزاد کی تخلیق کردہ شہرت کی دیوی ہوگی لیکن بجائے اس کے کرسی پر ایک یونانی دیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ صدر کی نشست پر نہایت خوبصورت شیشے کی الماریاں تھیں جن میں مراکو کے چمڑے کی بنی ہوئی جلدیں تھیں جن پر سنہرے حروف میں کتابوں کے نام نقش تھے نفاست سے چنی ہوئی تھیں، مگر حاضرین جلسہ کی طرف جو نگاہ اٹھائی تو جتنے لوگ دو رویہ کرسیوں پر بیٹھے تھے وہ سب قریب قریب وہی تھے جنھیں میں کچھ منٹ پہلے آزاد کے دربار میں دیکھ چکا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ تمام لوگ نیم مغربی لباس میں تھے، اس کے علاوہ ہر شخص کے سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر تواضع کے لئے سگریٹ سگار، دیا سلائی اور خاکستر دان رکھے ہوئے تھے، میری سمجھ میں یہ معاملہ کچھ نہ آیا پنڈال کے اندر بیٹھنے والوں میں وہی اکبر، فیضی اور وہی ذوق و غالب، سب موجود تھے۔ لیکن دربار کی کایا پلٹ ہو گئی تھی، اس گتھی کو سلجھانے کے لئے میں ذرا دیر کے لئے وہاں سے ہٹ آیا۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں کوئی اور شخص جسے میری طرح دربار میں جانے کی صورت نظر نہ آتی ہو یہاں قبضہ کر لے قنات درست کر دی تاکہ روشنی چھن کر باہر نہ آئے اور خود پنڈال کے چاروں طرف گھومنے لگا کہ ممکن ہے کوئی ایسا آدمی مل جائے جس سے یہاں کے حالات معلوم ہو سکیں، بڑی دیر تک گھومتا رہا لیکن کوئی ایسا نہ ملا جس سے کچھ حال معلوم ہوتا۔ ہر شخص بیحد مصروف نظر آتا تھا۔ قرینہ سے معلوم ہوا کہ بہت سے لوگ پنڈال میں جانے کے منتظر ہیں کچھ ایسے ہیں جن کے پاس ٹکٹ موجود ہیں مگر ان کا نمبر ابھی نہیں آیا ہے اور کچھ لوگ وہ ہیں جن کے پاس ٹکٹ نہیں ہے وہ اس کے حاصل کرنے کے انتظام میں ہیں اور اندر بیٹھنے والوں سے مدد لینے کا طریقہ سوچ رہے ہیں۔ غرض عجب نفسی نفسی کا عالم ہے۔ میں نے کئی آدمیوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کرنا چاہا مگر کسی نے نہ سنی۔ آخر ہار کر میں دروازے کی طرف چلا۔ ایک صاحب نے جو اتفاق سے میری طرف منہ کئے سگار سے دھواں نکال رہے تھے، مجھے غور سے دیکھا۔ مجھے معاً یہ خیال گزرا کہ میری پریشاں حالی جاذب توجہ ہوئی۔ میں نے مغربی طریقہ سے سلام کیا اور ذرا ان سے قریب ہو گیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دیکر کہا۔ ابھی انٹرول (وقفہ) ہے ذرا ٹھہر کر اندر جائیے گا۔ مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں اندر جانے والوں میں نہیں ہوں بلکہ ایک نووارد ہوں اور صرف اس اجتماع کا سبب معلوم کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے بتایا کہ یہ دربار عموماً ساٹھ ستر سال کے بعد منعقد ہوتا ہے لیکن ابکی یہ اس وجہ سے وقت سے پہلے منعقد ہو رہا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ جنھیں شہرت دوام کی سند حاصل ہونا چاہئے تھی مہتمم دربار (رجسٹرار) کی غفلت اور ذاتی اغراض کی بنا پر نہ مل سکی اور بیچارے کس مپرسی کی

حالت میں پڑے ہوئے ہیں میرے استفسار پر اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لوگ جو دروازے پر کھڑے ہیں موجودہ دور کے نقاد ہیں اور مغربی اصول تنقید سے واقف ہیں اور بقائے دوام کے دربار میں جانے کی اسی کو اجازت دیتے ہیں جو ان کے معیار پر صحیح اُترتا ہے۔ اس نے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ جتنے لوگ تم کو نظر آرہے ہیں وہ ہیں جن کو اس سے قبل کے دربار میں سند مل چکی تھی مگر ان نقادوں نے زبردستی ان کی جانچ پڑتال کر کے ان سندوں کی تصدیق مزید کر کے دعوت ناموں کے ساتھ انھیں شریک مجلس کیا ہے۔ جو نئے آنے والے ہیں ان کی البتہ خوب جانچ کی جاتی ہے تب کہیں ان کو اجازت دیجاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے درجے بھی مقرر کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اندر پہونچنے پر اور رائے عامہ کے ذریعہ درجہ بدل بھی جاتا ہے۔

میں نے "فرشتہ امداد" کا شکریہ ادا کیا اور پھر گھومتا ہوا قنات کے پاس آگیا اور آہستہ سے قنات کھسکا دی۔ چونکہ جلسہ کی پوری کارروائی دیکھنے کا ارادہ تھا اس لئے جیب سے رومال نکال کر گھاس پر بچھا دیا اور پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ چند ہی سکنڈ کے بعد لاؤڈ اسپیکر سے آواز آئی "دنیائے مرثیہ کا تاجدار انیس" ساتھ ہی میر انیس مراثی کی تین ضخیم جلدیں نظامی پریس کی چھپی ہوئی بغل میں دبائے نہایت متانت کے ساتھ صدر کی جانب بڑھے اور بہ ادب سلام کر کے کتابیں نذر گزرانیں۔ صدر نے مسکراتے ہوئے انیس کا خیر مقدم کیا۔ فضا تالیوں سے گونجی اور انیس، غالب، ذوق اور مومن کے بالمقابل جا کر بیٹھ گئے، تالیوں کی گونج کم ہوئی تو داغ دہلوی کی آمد کا اعلان ہوا۔ ان کا نام سنتے ہی ذوق کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر غالب، مومن اور میر کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ مگر بولا کوئی نہیں۔ صرف ایک آواز ایک کونے سے سنائی دی یہ تو ارباب نشاط کے شاعر ہیں۔ یہاں کیسے؟ دوسری آواز آئی ہاں! ہاں! خبردار شہریار دکن کے استاد ہیں آنے دو۔ جس پر ذوق اور ظفر نے ان کی سفارش کی کہ جرأت کے انداز کے واحد نمایندے ہیں انھیں ضرور جگہ ملنا چاہئے۔ صدر نے تسلیم کیا۔ داغ حیدرآبادی لباس میں آگے بڑھے چند چھوٹے بڑے مجلے پیش کر کے جلدی سے ذوق کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اب امیر مینائی کی باری آئی۔ کسی نے کہا کہ داغ کی صحبت نے ان کو بھی خراب کر دیا مگر جب انھوں نے اپنے ناتمام لغت کے اجزا دکھائے تو انھیں بھی داغ کے پہلو بہ پہلو جگہ مل گئی، امیر مینائی نے بیٹھتے ہی صدر سے یہ درخواست کی کہ باہر مشہور مداح پیمبر محسن کاکوروی موجود ہیں جنھیں دربان داخل نہیں ہونے دیتے ہیں انھیں بھی آنے کی اجازت دیجائے، نعت میں ان کی مثال ناپید ہے صدر نے حاضرین سے رائے لی سب نے امیر کی تصدیق کی اور محسن مدحیہ مثنویوں اور چیستانوں کا مجموعہ لئے داخل ہوئے اور صدر کو کتاب نذر کر کے امیر مینائی کے پاس بیٹھ گئے۔

دفعتاً باہر ایک شور ہوا، معلوم ہوا کہ نثر اردو کے بابا آدم (بقول حالی) سر سید احمد خاں تشریف لا رہے ہیں اور ان کے ساتھ ان کے دوست چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک انھیں پہونچانے آئے ہیں مگر سر سید تنہا نہیں آنا چاہتے ہیں، اور انھیں ساتھ لانا چاہتے ہیں بڑی رد و کد کے بعد صدر نے انھیں بھی اجازت دی۔ سر سید

داخل ہوئے۔ کتابوں کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ چل کر صدر کی میز پر ایک پورا پشتارہ جسمیں آثار الصنادید، تفسیر قرآن، اسباب بغاوت ہند اور تہذیب الاخلاق کے پرچے اور خطبات احمدیہ وغیرہ شامل تھیں ڈھیر کر دیا، فضا پھر تالیوں سے گونجی اور سرسید غالب کے بائیں بازو پر آکر بیٹھ گئے اور بقیہ لوگ سرسید کی پیچھے والی صف میں جاکر بیٹھ گئے ان کی طرف سے جو نظر پھری تو ڈاکٹر نذیر احمد سر پر قرآن شریف مترجم رکھے اور اسی بغل میں مذہبی ناول دبائے جلدی جلدی قدم اُٹھائے شہ نشین کے قریب آئے۔ آپ کا تعارف یہ کرایا گیا کہ آپ تعلیم نسواں کے حامیوں میں ہیں اور مشرقی اور مغربی معاشرتوں کے نقاد ہیں، امہات الامۃ کے متعلق کچھ کانا پھوسی بعض لوگوں میں ہوئی لیکن صدر تک بات نہیں پہونچی چنانچہ آپ کو سرسید کی پشت پر جگہ مل گئی۔

پھر پنڈال میں ایک زور کا دھکا لگا، ساتھ ہی زنجیروں کے بجنے کی آواز آئی اور لاؤڈ اسپیکر یہ کہتا ہوا سنائی دیا "ایک دیوانہ پیروں میں زنجیریں پہنے بہت سی کتابوں کے مسودے جن میں کچھ مکمل اور کچھ نامکمل ہیں ہاتھوں میں لئے زبردستی داخل ہونا چاہتا ہے منجملہ اور دعوؤں کے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ پچھلی مرتبہ بقائے دوام کا مہتمم وہی تھا اور اپنا نام آزاد بتاتا ہے، آزاد کا نام سنتے ہی اس سے قبل کہ صدر کچھ کہے اکبر بادشاہ نے اُٹھکر شاہانہ انداز میں سفارش کی کہ اس نے میرے ان کارناموں کو زندہ کیا جو تین صدیوں کی مدت نے دلوں سے محو کر دیا تھا۔ اس کو ضرور جگہ ملنا چاہیے۔ اکبر کی دیکھا دیکھی ابوالفضل نے بھی زبان کھولی کہ اگرچہ اس نے میری آئین اکبری توڑ مروڑ کر دربار اکبری پیش کی ہے لیکن چونکہ میرے ولی نعمت کا نام پھر زندہ کیا ہے لہذا میں بھی سفارش کرتا ہوں، اب ذوق کی باری آئی جنھوں نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دئے۔ لیکن ظفر نے اُٹھ کر کہا کہ وہ اس قابل نہیں کہ اس دربار میں جگہ پائے اس نے مجھ پر تہمت تراشی اس نے مری عمر بھر کی کمائی اُستاد ذوق کے حوالے کر دی، غالب اور مومن نے بھی اس کی تائید کی لیکن آزاد نے جتنے شعرا کو "آب حیات" پلا کر زندہ کیا تھا ان سب نے سفارش کی۔ آخر صدر نے یہ اجازت دی کہ وہ پابجولاں لایا جائے اور کرسی پر اس طرح بٹھایا جائے کہ بھاگ کر ہنگامہ نہ بپا کرے۔ آزاد کئی آدمیوں کی معیت میں داخل ہوئے۔ بہت اُچھلے کودے اور اپنی کل کائنات دربغل میز پر پٹخ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایک زنجیر ان کی ذوق کے ہاتھ میں دیدی گئی اور دوسری ایک خالی کرسی میں باندھ دی گئی۔

ان سے فرصت ہوئی تو حالی پانی پتی کی آمد کی خبر مشتہر ہوئی۔ ان کا نام سنتے ہی غالب اور سرسید مارے خوشی کے اپنی کرسیوں سے اُچھل پڑے اور ذوق و آزاد نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ حالی نہایت خاموشی سے داخل ہوئے۔ چہرے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی شعر کی تنقید میں مصروف ہیں نظر نیچے کئے ہوئے سیدھے صدر کی طرف گئے مسدس حالی، یادگار غالب، حیات جاوید اور "مقدمہ شعر و شاعری" نذر کرکے واپس ہوئے اور غالب اور سرسید کو نہایت ادب سے سلام کیا۔ سرسید نے جھپٹ کر چمٹا لیا اور اپنی کرسی کے برابر دوسری کرسی پر بٹھا لیا۔

اب علامہ شبلی نعمانی کی آمد آمد کا شور ہوا شبلی کا نام سنتے ہی جتنے ایرانی اور ہندوستانی دربار میں بیٹھے تھے سب شگفتہ ہو گئے، البتہ خافی خاں اور آزاد کے چہرے اتر گئے، سب نے شبلی زندہ باد کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ شبلی بیساکھی کی مدد سے آگے بڑھے سینہ پر مجیدیہ تمغہ لگائے، کتابوں کا تھیلا پشت پر، ابھی صدر کی نشست تک نہ پہونچنے پائے تھے کہ حضرت اورنگ زیب نے بڑھکر لپٹا لیا۔ پیشانی پر بوسہ دیا اور کچھ دعائیں پڑھکر دم کیں۔ صدر نے بھی ہاتھ کی حرکت سے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی کتابوں کا پورا سٹ نہایت احترام سے دونوں ہاتھوں میں لیکر اپنی میز کی داہنی جانب رکھ لیا، ہر شخص شبلی سے مصافحہ کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ شبلی فرداً فرداً ہر شخص سے مصافحہ کرنے کے بعد بہت دیر کے بعد سرسید کے قریب حالی کے مخالف سمت میں بیٹھ گئے۔ بہت دیر کے بعد جلسہ میں سکون ہوا۔

ان کے بعد شرر کی باری آئی۔ ان کے آنے پر بھلا کسکو اعتراض ہوتا۔ وہ آئے اور اس شان سے کہ ناولوں کا پوٹ ایک کندھے پر دلگداز کے پرچے دوسرے ہاتھ میں، مکتب تاریخی بغل میں داب، ایک ہاتھ میں "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" لئے مغربی لباس زیب تن اور اس پر ایک بڑی سفید ڈاڑھی۔ نہایت مہذب صورت بنائے آہستہ آہستہ آرہے تھے کہ کسی نے ٹوکا آپنے اہل بیت پر اتہام لگائے ایک آواز آئی آپ "پردہ شکن" بھی ہیں۔ مگر کسی نے اثر نہیں لیا۔ لہٰذا صدر کو پوٹ کا پوٹ دیکر کسی بہتر جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ حالی نے اشارے سے بلایا اور وہیں جاکر بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی قہقہوں کی آواز آئی۔ اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کا نام پکارا گیا۔ حالی اور شرر دونوں کے چہرے سجاد حسین کا نام سنتے ہی اتر گئے اور کرسیوں پر جنبش کرنے لگے۔ آزاد بھی کسمسائے، کچھ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ کچھ مارے تہذیب کے ہونٹ چبا کر ہنسی روک رہے تھے، ادھر سجاد حسین ایک ہاتھ میں حاجی بغلول کا کارنامہ لئے اور بغل میں اودھ پنچ کے پرچے دبائے داخل ہوئے کہ پورا پنڈال قہقہستان بن گیا۔ حتیٰ کہ صدر کے ہونٹوں پر بھی ہلکا سا تبسم کھیلنے لگا۔ سجاد حسین نے آگے بڑھ کر حاجی بغلول کا صدر سے تعارف کرایا۔ پھر اودھ پنچ کے فائلوں سے میز پاٹ دی۔ واپس لوٹے تو کوئی جگہ پسند نہ آئی اور کرسی گھسیٹ سب سے الگ صدر کے چبوترے کے قریب نیچے بیٹھ گئے۔ سجاد حسین کے بیٹھتے ہی سرشار قہقہوں کے ساتھ داخل ہوئے سیر کہسار اور فسانہ آزاد کی بڑی بڑی وزنی جلدیں پیش کرکے سجاد حسین کے پاس ذرا پیچھے دب کر بیٹھ گئے۔

سرشار کے بیٹھتے ہی یک بیک لڑکوں کا شور و غل سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ مدرسوں کے بچے بچیاں زبردستی اسمٰعیل میرٹھی کو پکڑ لائے ہیں، وہ لاکھ دامن چھڑا کر بھاگتے ہیں لیکن لڑکے انھیں جانے نہیں دیتے اور صدر سے درخواست ہے کہ انھیں بھی ان کا نمایندہ سمجھ کر داخل کر لیا جائے۔ صدر نے رائے طلب کی۔ شیخ سعدی نے فوراً بچوں کی تائید کی اسمٰعیل آئے اور اپنا کلیات نذر کرکے سعدی سے بہ پاس ادب ذرا پیچھے ہٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔

انھیں کے بیٹھتے ہی پھر زور کا قہقہہ پڑا۔ معلوم ہوا کہ حضرت اکبر آبادی کے داخلے کا پیش خیمہ ہے۔ کلیات کی

تین جلدیں بغل میں دابے ایک ہاتھ میں تسبیح لئے داخل ہوئے اور شہ نشین تک پہونچتے پہونچتے شبلی- سرسید- حالی اور شرر سب ہی سے ٹکر لیتے ہوئے آئے - البتہ سجاد حسین کو بڑے تپاک سے سلام کیا اور انھیں کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔
اتنے میں ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے اچھوت اور دیہاتی جیکارے لگاتے چلے آرہے ہیں- دروازے کے قریب یہ شور رکا اور اعلان کیا گیا کہ منشی پریم چند دیہاتی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے نمائندے بن کر آئے ہیں اور داخل دربار ہونا چاہتے ہیں- سب کو شوق ہوا کہ ان کی زیارت کریں- چنانچہ صدر کے ایما سے وہ بلائے گئے، منشی جی سوٹ میں ملبوس فلٹ کیپ سر پر دھرے مختصر افسانوں اور "میدان عمل" کے خوبصورت کتابچے لئے ڈائس تک پہونچے- دیوی کو نمسکار کرکے اپنی محنت کی بھینٹ چڑھائی، شہرت کا خلعت ملا- واپس آئے اور شرر سے زرا پیچھے کرسی سرکا کر بیٹھ گئے- انکے پیچھے آغا حشر کاشمیری اپنے ڈرامے لیکر داخل ہوئے- کالیداس نے بڑھکر ان کا خیر مقدم کیا- شرر- پریم چند اور سجاد حسین نے بھی مبارکباد دی، صدر کو ڈرامے نذر کرکے کالیداس کے پاس برابر بیٹھ گئے-

اتنے میں ایک نحیف و زار بزرگ، پستہ قد، سیاہ فام چار موٹی موٹی بڑی ضخامت کی جلدیں رعشہ دار ہاتھوں میں اٹھائے ڈگمگاتے ہوئے آتے نظر آئے- معلوم ہوا کہ مولوی نور الحسن نیر مولف نور اللغات ہیں- امیر مینائی نے سہارا دیکر ڈائس تک پہونچایا- محسن نے اٹھکر پیشانی کو بوسہ دیا- ان کی محنت نظر استحسان سے دیکھی گئی اور انھیں امیر مینائی کے پاس ہی جگہ مل گئی-

ایک بار پھر شور ہوا کہ ایک آزاد فقیر نظیر داخل مجلس ہونا چاہتے ہیں اور دو شخص محمود اکبرآبادی اور نیاز فتحپوری کی سفارش لیکے آئے ہیں اور کچھ سفید فام مغربی لوگ بھی ان کے ہم زبان ہیں- ان کو شکایت ہے کہ گزشتہ دربار میں مہتمم نے قصداً ان سے چشم پوشی کی- صدر نے آزاد کی طرف دیکھا- آزاد نے شرم سے گردن جھکالی- طلبی ہوئی- اس شان سے داخل ہوئے- ٹانگوں میں تہمد گلے میں کفنی، بغل میں مرگ چھالا اور ہاتھ میں عصائے فقیری لئے کھڑاؤں پہنے، مسکراتے ہوئے صدر کے قریب پہونچے- ترقی عمر کی دعا دیکر مرگ چھالے سے کلیات نظیر اکبرآبادی نکالی اور ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور میر کے پاس جا کر بیٹھ گئے- کچھ لوگ انھیں بھی دیکھ کر جز بز ہوئے لیکن کسی کو دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی لوگ ابھی ان کے دیکھنے ہی میں مصروف تھے کہ شاعر مشرق کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا- پوری مجلس سنبھل کر بیٹھ گئی- پردہ اُٹھا اور "شاعر مشرق" علامہ اقبال پیام مشرق- بانگ درا، زبور عجم، ضرب کلیم، اور جاوید نامہ کے دیدہ زیب ایڈیشن لئے چہرے سے عمل، آزادی اور زیست کے آثار ہویدا، نہایت تمکنت سے بڑھے- پورے جلسہ نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا، چھت سے پھولوں اور پنکھڑیوں کی بارش ہونے لگی- سعدی، حافظ، خاقانی، فیضی، داغ، شبلی، اور غالب نے ہاتھوں ہاتھ صدر تک پہونچا دیا- ادب کی دیوی نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر ہوا میں رقص کئے زندۂ جاوید شاعر کے الہامات لیکر سامنے رکھ لئے- اقبال پیچھے ہٹے- حافظ، سعدی اور فیضی نے اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنی صف کے

آگے ایک کُرسی بچھا کر اس پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک پیر مرد ایک ہاتھ میں آنسوؤں کا ہار لئے اور دوسرے میں بڑی چھوٹی چند کتابیں لئے سوگوار صورت بنائے آئے دکھائی دئے۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ راشد الخیری ہیں جو عورتوں کی دُنیا کے بڑے ہمدردوں میں ہیں، صدر کو بھی ان سے دلچسپی ہوئی۔ نذر پیش کر کے شرر کے پاس بیٹھ گئے۔

ابھی کوئی اور نہ آنے پایا تھا کہ صدر نے اپنی نرم آواز میں کہا کہ ایک ادب کا پیاسا اگرچہ ابھی اس کی اہلیت نہیں رکھتا کہ باقاعدہ اس مجلس میں شامل ہو کئی گھنٹے سے قنات کے پاس بیٹھا جلسہ کی کارروائی دیکھ رہا ہے اور اپنی ادب دوستی کا ثبوت دے رہا ہے لہذا ہم اسے بحیثیت مہمان کے شرکت مجلس کی دعوت دیتے ہیں جو لوگ صدر دروازے پر کھڑے ہیں اسے جا کر لے آئیں۔ میں نے جو اپنی طلبی کی بھنک پائی جلدی سے کھڑا ہو گیا اتنے میں پیروں کی چاپ سنائی دی۔ تیزی سے جو گھوما تو آنکھ کھل گئی۔ لیمپ جل رہا تھا، کتاب نیچے پڑی تھی۔

سراج احمد علوی

ل۔ احمد صاحب کے افسانے

انشائے لطیف:۔ اُردو ادب میں صاحب "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی میں جو معیار ل۔ احمد صاحب نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ ان کا ہر افسانہ علم و حکمت، جذبات و واردات اور نفسیات کی بولتی تصویر اور اُردو ادب میں مستقل اضافہ ہوتا ہے۔ یہ چند افسانوں کا مجموعہ ہے۔ آپ کو اگر سلاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذبات حسن و عشق کی صحیح نقاشی دیکھنا ہے اور ادب و شعریت کا ذوق ہے تو اس مجموعہ کو دیکھئے۔ پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد عہ

نغمات:۔ اس مجموعہ میں جناب ل۔ احمد صاحب کے ساٹھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں جسے نثری شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اُردو کی لطافت و نفاست کا اندازہ کرنے کے لئے اس انتخاب کا دیکھنا ازبس ضروری ہے۔ ۱۳۶ صفحے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

زندگی کے کھیل:۔ ل۔ احمد صاحب کی بارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے۔ جس میں معاشری خرابیوں اور فلاکت زدہ سماج کی زندہ تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ۱۵۰ صفحات قیمت مجلد ایک روپیہ۔

محبت کا فسانہ:۔ یہ ایک طویل فسانہ ہے جس میں ل۔ احمد صاحب نے مسرت از دواج سے بحث کی ہے لیکن اس غایت تصویر کے ساتھ ساتھ اس کا ہر باب ایک مستقل فسانہ ہے اور ہر باب میں معاشری و اخلاقی مسایل پر حکیمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ساڑھے تین سو صفحات قیمت مجلد دو روپیہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

کارگاہِ قدرت میں عزمِ انسانی کی دلچسپ داستان

آپ کسی صاف دن میں آسمان کی طرف دیکھیں گے تو آپ کو سوائے نیلگوں فضا کے کچھ نظر نہ آئے گا، اسی طرح رات کو بیشمار تاروں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دے گا، اس لئے اگر ہمارے کرۂ زمین کی کوئی چھت ہو سکتی ہے تو اسے اربوں میل کی بلندی پر ہونا چاہئے، لیکن آپ یہ سنکر تعجب کریں گے کہ ہماری دنیا کی چھت ہم سے صرف دس میل کی بلندی پر واقع ہے جسے علمی اصطلاح میں فضائے قائمہ (Stratosphere) کہتے ہیں۔

ہم اسے چھت کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ وہ ہمیں شدید گرمی اور سردی سے محفوظ رکھتی ہے، ٹوٹنے والے تاروں کی زد سے بچاتی رہتی ہے اور اس مہلک برقی رو کی راہ میں حایل ہو جاتی ہے جو فضا میں پیدا ہو کر زمین کی طرف آتی ہے اور جسے اصطلاح میں (Cosmic Radiation) کہتے ہیں۔

نصف صدی قبل انسان کو اس چھت کا حال بالکل معلوم نہ تھا، اور اب بھی پوری طرح اس کا علم حاصل نہیں ہوا لیکن جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ آیندہ تحقیقات ہمارے ان نظریوں میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دے گی جو کائنات کے متعلق ہم نے قایم کئے ہیں۔

بیسویں صدی کی آغاز تک زمین کے بہت سے حصے ایسے تھے جہاں انسان کا گزر نہ ہوا تھا، لیکن اس صدی کے اختتام پر رائٹ (Wright) نامی دو بھائیوں نے ہوا میں اُڑنے والی مشین بنائی اور اس کے بعد ہوائی جہاز طیار کئے گئے جو ایورسٹ پہاڑ کی چوٹی پر اُڑے، جنھوں نے دریائے امیزن (Amazon) کے ناقابل گزر جنگلوں کی تصویریں لیں اور قطبین کے برف پوش حصوں کے نقشے طیار کئے۔ اس سلسلہ میں لوگوں نے زمین کے اندر اور سمندروں کے نیچے بھی پہونچنے کی کوشش کی، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ زمین کے اندر ہر دو سو فیٹ کی گہرائی پر ایک ڈگری حرارت بڑھ جاتی ہے اور ۳۰۰۰۰ فٹ کی گہرائی میں گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سمندر کے اندر نصف میل سے زیادہ کا حال نہ معلوم ہو سکا۔

جب انسان کو زمین اور سمندر کی گہرائیوں کی طرف سے مایوسی پیدا ہوئی، تو اس نے فضا کی جستجو شروع کی یہ جستجو ۱۹۲۹ء سے شروع ہوتی ہے اور آج کی صحبت میں اسی کی داستان آپ کو سنانا ہے۔

۱۹۲۹ء میں اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ڈاکٹر الگزنڈر ولسن (Dr. A. Wilson) نے تھرمامیٹر باندھکر

کنکوے اُڑائے تاکہ اس طرح اوپر کی فضا کا درجۂ حرارت معلوم ہو سکے، اس کے ۲۵ سال بعد ڈاکٹر جفریز (Jefferies) اور جین بلنچارڈ (Jean Blanchard) نے اسی غرض سے غبارے اُڑائے، اسی سلسلہ میں اور لوگوں نے بھی پوری اُنیسویں صدی اسی طرح کے تجربات میں صرف کر دی اور فقط اتنا حال معلوم ہو سکا کہ ہم جس قدر بلند ہوتے جاتے ہیں اوپر کی فضا زیادہ سرد، زیادہ ہلکی اور زیادہ پتلی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وزن بہت ہلکا ہو جاتا ہے، سانس لینا دشوار ہوتا ہے اور منجمد ہو کر مر جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ان جستجو کرنے والوں میں جیمس گلیشر (James Glaishar) اور ہنری کاکس ول (Henry Coxwell) کا نام سب سے پہلے سامنے آتا ہے، یہ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۶ء تک چار سال کے اندر اٹھائیس مرتبہ غباروں میں بیٹھ کر اوپر گئے اور ہر چند ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ ۳۷ ہزار فٹ کی بلندی تک پہونچ گئے تھے، لیکن ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی تک وہ یقیناً پہونچے۔

گلیشر نے ان تجربات کے سلسلہ میں بہت سی باتیں معلوم کیں، مثلاً درجۂ حرارت، نمی کی مقدار، فضا کی کہربائیت، آکسیجن کی مقدار اور اسی کے ساتھ یہ کہ ان چیزوں کا اثر انسانی جسم پر کیا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ ۲۰ ہزار فٹ کی بلندی پر نبض کی رفتار ۷۶ سے ۱۱۰ تک پہونچ گئی اور ہانپنے کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ جب غبارہ اور بلند ہوا تو وہ بیہوش ہو گیا۔

۱۸۷۵ء میں پیرس کا ایک شخص گیسٹن ٹسانڈیئر (Gaston Tissandier) اپنے دو ساتھیوں کو لیکر ۲۷۹۵۰ فٹ کی بلندی تک اوپر گیا۔ اس کے ساتھی تو دم گھٹ کر مر گئے لیکن وہ زندہ واپس آیا۔

۱۹۰۱ء تک کوئی شخص اس سے زیادہ اوپر نہیں جا سکا تھا لیکن اس سال ڈاکٹر برسن (Dr. Berson) اور سورنگ (J. R. Suring) ۳۴۵۰۰ فٹ تک اوپر گئے۔ ہر چند یہ اپنے ساتھ آکسیجن لے گئے تھے لیکن پھر بھی غبارہ اُترنے سے پہلے ہی یہ بیہوش ہو چلے تھے اور ۳۶ ہزار فٹ سے زیادہ یہ اوپر نہ جا سکے۔

ڈاکٹر برسن کی اس کوشش سے کہ دس سال قبل، ماہرین موسم خالی غباروں کے ذریعہ سے خاص قسم کی حرارت پیما آلات اوپر پہونچا کر کچھ حالات فضا کی حرارت کے معلوم کر چکے تھے۔ چونکہ خالی غباروں کے اُڑانے میں زیادہ صرف بھی نہیں تھا اور کسی جان کے ضایع جانے کا بھی سوال نہ تھا اس لئے یہ تجربات اکثر جگہ کئے گئے اور ایک فرانسیسی سائنس داں نے بھی جس کی ایک رصدگاہ پیرس کے قریب تھی تجربہ شروع کیا۔ یہ بھی اسی نتیجہ پر پہونچا کہ فضا میں آپ جتنی زیادہ بلندی پر پہونچیں گے، سردی اتنی ہی زیادہ محسوس ہوگی، یہاں تک کہ ممکن ہے کسی جگہ درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے دو تین سو ڈگری نیچے گرا ہوا ہو۔ فضا میں درجۂ حرارت کم ہونے کا اندازہ یہ کیا گیا تھا کہ ہر ہزار فٹ کا اندازہ یہ کیا گیا تھا کہ ہر ہزار فٹ کی بلندی پر تین درجے حرارت کے کم ہو جاتے ہیں، چنانچہ ۱۸۹۴ء میں خود ڈاکٹر برسن معلوم کر چکا تھا کہ ۳۱۵۰۰ فٹ کی بلندی پر پارہ زیادہ نیچے چلا جائے گا اور سردی اس سے زیادہ ہوگی، لیکن یہ خیال غلط نکلا۔

سنہ ۱۸۹۹ء اور سنہ ۱۹۰۲ء کے درمیان ڈی بورٹ (De Bort) سیکڑوں غبارے تھرمامیٹر رکھکر اوپر اڑائے اور اس تجربہ سے یہ نتیجہ نکلا کہ چھ یا سات میل کی بلندی پر جو درجۂ حرارت پایا جاتا ہے، وہ قایم رہتا ہے یعنی اس کے اوپر آپ جتنا جاہیں چلے جائیں پارہ نقطۂ انجماد سے وہی ۵۵ درجے نیچے رہے گا، زیادہ نہ گرے گا۔

بعد کو مزید تجربات کئے گئے اور پتہ چلا کہ فضا کا وہ حصہ جو زمین سے چھ سات میل کی بلندی پر ہے اور جس کا درجۂ حرارت یکساں رہتا ہے ۲۵ میل کی موٹی تہ میں زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اور اس کا نام انھوں نے فضائے قائمہ (Stratosphere) رکھا۔ اس ۲۵ میل کی تہ اور کرۂ زمین کی اُس فضا کے درمیان جس میں ہم سانس لیتے ہیں ایک اور فضا پانچ، چھ میل کی پائی جاتی ہے اور اسکا نام انھوں نے (Tropospherе) رکھا جسے ہم فضائے حارہ کہہ سکتے ہیں، اس فضا کے بعد ہماری زمین کی فضا شروع ہوتی ہے جس کی تہ دو میل کی ہے اور اسے اصطلاح میں (Tropopause) یا "فضائے ارضی" کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان تجربات سے فضا کی تین تہیں دریافت ہوئیں، ایک فضائے ارضی دو میل کی، دوسری فضائے حارہ ۶، ۷ میل کی اور تیسری فضائے قائمہ ۲۵ میل کی اور یہ خیال کہ فضا ایک ہی ہے غلط نکلا۔ اس جگہ یہ ظاہر کر دینا مناسب ہوگا کہ فضائے قائمہ کی حد ایک ہی فاصلہ سے شروع ہوتی ہے اور "منطقہ معتدلہ" پر کم فاصلہ سے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے آپ ابر کے غبارہ کو پھلائیں کہ درمیان میں وہ زیادہ ابھرا ہوا ہوگا اور کناروں پر کم۔ اسی کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہئے کہ فضائے قائمہ کا ٹمپریچر ہر جگہ ایک نہیں ہے۔ یعنی اس کا ٹمپریچر زیادہ گھٹتا بڑھتا تو نہیں ہے، لیکن مختلف حصوں کا ٹمپریچر مختلف ہوتا ہے مثلاً قطبین کے سامنے فضائے قائمہ کا ٹمپریچر ۶۱ سے ۶۲ درجے تک صفر سے نیچے رہتا ہے اور خط استوا پر ۵۲ درجے نیچے۔ فضائے قائمہ میں کُہر یا بادل تو نہیں پائے جاتے لیکن ہوا کے طوفانوں کا وہاں ضرور اندیشہ ہے، اس لئے ہوائی جہازوں کا اس فضا کو عبور کرکے اور زیادہ بلندی پر چلا جانا آسان نہیں۔

فضائے قائمہ کی سب سے زیادہ عجیب چیز وہ ہے جسے "فضائی شعاعیں" (Cosmic Rays) کہتے ہیں اور انھیں کی تحقیقات کرنے کے لئے ڈاکٹر آگسٹ پکارڈ (Auguste Piccard) نے فضائے قائمہ میں پہونچنے کی کوشش کی تھی۔

یہ شعاعیں کہاں سے آتی ہیں؟ اس کے متعلق صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ "فضائے قائمہ" سے بہت دور کسی اور جگہ سے آتی ہیں اور اُن کی قوت نفوذ اتنی زبردست ہے کہ وہ فضاؤں کو چیر پھاڑ کر صرف زمین ہی تک نہیں پہونچتیں بلکہ زمین کے اندر اور سمندر کی تہ تک پہونچ جاتی ہیں۔ وہ ہر وقت ہمارے جسموں کے اندر سے بھی گزرتی رہتی ہیں لیکن چونکہ فضائے قائمہ اور فضائے حارہ سے چھن کر آتی ہیں اس لئے بہت کمزور ہو جاتی ہیں، ورنہ ہم ایک لمحہ زندہ نہ رہ سکیں ان شعاعوں کی قوتِ نفوذ اتنی زبردست ہے کہ اگر ہم زمین کو سیسہ کی ۲۳ فٹ موٹی چادر میں لپیٹ دیں تو شاید یہ

شعاعیں نہ آسکیں ورنہ اور کوئی صورت ان کو روکنے کی نہیں ہے۔

جسوقت ان شعاعوں کے متعلق جستجو کا خیال پیدا ہوا تو یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ ان کا صحیح حال ہم کو اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب ہم فضائے قائمہ میں پہونچ جائیں اور ہر چند یہ بات خطرہ سے خالی نہ تھی، لیکن ڈاکٹر پکارڈ (Dr. Piccard) اور ان کے ساتھی پال کیپفر (Paul Kipfer) طیار ہوگئے اور سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کا اہتمام شروع کردیا۔

ڈاکٹر پکارڈ نے جو غبارہ طیار کیا وہ دوسرے غباروں سے بالکل مختلف تھا، انھوں نے اپنے غبارہ میں گیند کی شکل کا ایک ظرف الیومنیم کا بناکر آویزاں کیا تاکہ اس میں بیٹھکر وہ اوپر جاسکیں۔ اس کا قطر سات فٹ کا تھا اور اس میں نہایت موٹے شیشے کی کھڑکیاں تھیں تاکہ ان سے باہر کا حال معلوم ہوسکے۔ آکسیجن کی بھی کافی مقدار ساتھ رکھی اور دوسری احتیاطیں بھی کیں تاکہ سردی سے ہلاک نہ ہوجائیں۔ غبارہ کا قطر ایک سو فٹ کا تھا جس میں ۴۹۰۰۰ مکعب فٹ گیس آسکتی تھی۔

۲۷ مئی سنہ ۳۱ء کو یہ غبارہ روانہ ہوا اور اس کا صرف ساتواں حصہ گیس سے بھرا گیا کیونکہ بلندی پر ہوا کا دباؤ کم ہونے کی وجہ سے گیس کو اور پھیل جانا تھا، اور زیادہ گیس بھرنے سے اس کے پھٹ جانے کا اندیشہ تھا، لیکن قبل اس کے کہ غبارہ بلند ہوتا، گنڈولا (یعنی الیومنیم کا کروی ظرف جس میں پکارڈ بیٹھا تھا) ٹیکی سے سرک گیا اور اس میں تھوڑا سا شگاف ہوگیا۔ جسکی وجہ سے آکسیجن گیس نکلنے لگی، لیکن پکارڈ نے شگاف کو روئی اور ویسلین سے بند کرکے غبارہ چھوڑ دیا۔

یہ غبارہ جرمنی کے ایک مقام آگسبرگ سے روانہ ہوا تھا اور ۲۵ منٹ کے اندر ۴۹ ہزار فٹ کی بلندی تک پہونچ گیا، اور جب وہ ۵۱۷۷۵ فٹ یا پونے دس میل کی بلندی پر پہونچا تو ایک ہی سطح پر قایم ہوکر میلوں ادھر اُدھر تیرنے لگا اور شام ہوتے ہوتے یہ نیچے اُتر آیا۔۔۔ بعض آلات کے ٹوٹ جانے سے اس تجربہ میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، لیکن دو باتیں ضرور متحقق ہوگئیں، ایک یہ کہ انسان فضائے قائمہ تک پہونچکر زندہ واپس آسکتا ہے اور دوسرے یہ کہ فضائی شعاعوں کی قوت، فضائے قائمہ پر بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

۱۸ اگست سنہ ۳۲ء کو ڈاکٹر پکارڈ پھر اُڑا اور ساڑھے دس میل اونچا چلا گیا، اس مرتبہ وہ بارہ گھنٹے تک اوپر ہی رہا اور کافی مطالعہ کا موقعہ اسے ملگیا۔

اس کے بعد روس کے ایک فوجی افسر اور سوویٹ کے دو سائنس دانوں برنبام (Birnbaum) اور گوڈونوف (Goudounoff) نامی ۳۰ ستمبر سنہ ۳۳ء کو اُڑے اور بارہ میل تک پہونچ گئے۔

دو مہینے بعد امریکہ کے بعض بحری افسروں نے کوشش کی لیکن وہ ساڑھے گیارہ میل سے زیادہ اونچے نہ پہونچ سکے سب سے بڑا غبارہ جو اس مقصد کے لئے طیار کیا گیا وہ وہ تھا جو جنوری سنہ ۳۴ء میں اُڑا اور تقریباً چودہ میل اونچا ہوگیا۔ اس غبارہ کی لمبائی ۱۷۰ فٹ تھی اور وزن دو ٹن تھا۔ قطر ۱۱۵ فٹ تھا اور ۲۵ ہزار مکعب فٹ گیس اس میں بھری جاسکتی تھی اس کے گنڈولا نہایت باریک فولادی چادر کا تھا اور استرے کے پھل سے زیادہ دبیز نہ تھا۔ اس میں ۳۰ فٹ مختلف قسم کے

آلات نصب کئے گئے تھے، جن میں ایک براڈکاسٹ کرنے والا آلہ بھی تھا، لیکن جب یہ زمین کے قریب آیا تو گنڈولا کی رسیاں ٹوٹ گئیں اور اس صدمہ سے آلات بھی ٹوٹ گئے اور آدمی بھی ہلاک ہوئے۔

اس واقعہ کے چھ مہینے بعد امریکہ کے بعض فوجی افسروں نے پھر کوشش کی۔ دیگر آلات کے ساتھ براڈکاسٹ کرنے کا آلہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ جس وقت وہ ۶۰ ہزار فٹ کی بلندی پر پہونچے تو انھوں نے زمین والوں کو یہ پیغام بھیجا کہ

"ہمارے غبارہ میں ۵۰ فٹ لمبا شگاف ہوگیا ہے اور ہمارا اوپر جانا بند ہوگیا ہے"

اس کے بعد غبارہ نیچے ۳۶ ہزار فٹ تک آگیا، لیکن ہوا کے طوفان نے اسے پھر اوپر کی طرف پھینک دیا۔ اب یہ پیغام موصول ہوا

"غبارہ کا نچلا حصہ پھٹ گیا ہے، نہیں کہہ سکتے کہ کب تک کام دیگا"

تھوڑی دیر کے بعد یہ پیغام آیا:-

"ہم ۵۰۰ فٹ فی منٹ کی رفتار سے نیچے آرہے ہیں"

اس کے بعد یہ خبر آئی کہ:

"ہم ۲۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے نیچے آرہے ہیں اور اب ہم کودنے ہی والے ہیں"

چنانچہ جس وقت غبارہ کا فاصلہ زمین سے ۵۰۰ فٹ رہ گیا تو یہ چھتریوں کے ذریعہ سے نیچے اتر آئے۔

دوسرے سال (سنہ ۱۹۳۵ء) یہ پھر اوپر چڑھے اور اس مرتبہ انھوں نے سارا اگلا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا یعنی یہ چودہ میل اونچے چلے گئے۔ ان کا گنڈولا ۹ فٹ قطر کا تھا اور سات ٹن وزنی گویا پیکارڈ کے گنڈولا سے نوگنا زیادہ وزنی۔ غبارہ کا رقبہ پونے تین ایکڑ تھا جس میں ۳۷ لاکھ مکعب فیٹ گیس بھری جاسکتی تھی۔

جو چیزیں یہ اپنے ساتھ لے گئے تھے ان میں تین آلات فضائی شعاع کی قوت ناپنے والے تھے، متعدد تصویر کھینچنے والے کیمرے تھے، روشنی و حرارت پیما آلات تھے لیکن سب سے زیادہ عجیب سامان مکھیوں کے انڈے تھے۔ ان کو اسلئے لے گئے تھے تاکہ ان فضائی کرنوں کے اثرات کا مطالعہ کریں۔

اس مہم کے سر کرنے والے اسٹونس (Stevens) اور انڈرسن (Anderson) تھے جو امریکی فوج میں کپتان کے عہدوں پر مامور تھے۔

اس سلسلہ میں غالباً ناموزوں نہ ہوگا اگر ہوائی جہازوں کی بلند پروازی پر بھی اک نگاہ ڈال لی جائے۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ہوائی جہازوں کی انتہائی بلند پرواز ۴۳۱۶۶ فٹ سے آگے نہ بڑھی تھی۔ دو سال بعد ایک اور ہوا باز نے ۱۶۰۰ فٹ کا اس میں اور اضافہ کیا۔

سنہ ۳۴ء میں ایک اطالوی ہوا باز ۴۷۳۵۲ فٹ تک پہونچا اور اسی سال ایک شخص وائلی پوسٹ (Wiley Post) ۴۸ ہزار فٹ کی بلندی تک گیا اور سات دن میں اس نے سارے کرۂ ارض کا چکر لگا لیا۔

لیکن فرانسیسی ہواباز کی طرح یہ بھی اس تجربہ میں ہلاک ہوگیا۔

اگست ۳۶ء میں فرانس کا ایک فوجی طیارہ ۴۸،۷۰۰ فٹ اونچا اُڑا اور اس کے ۶ ہفتے بعد ایک برطانوی طیارہ ۴۹۹۰۰ فٹ کی بلندی تک پہونچا۔

اس ریکارڈ کو ۳۷ء میں پھر اٹلی کے ایک ہواباز نے توڑا، یعنی وہ ۵۱۳۶۱ فٹ چلا گیا، لیکن ۱۲ر مئی ۳۷ء کو ایک انگریزی ہواباز، اس سے بازی لے گیا اور ۵۳۹۳۷ فٹ کی بلندی تک پہونچ گیا اور سوا دو گھنٹے تک اُڑتا رہا۔

ان پروازوں کے سلسلہ میں دو باتیں بہت دقت طلب نظر آئیں ایک یہ کہ اوپر ہوا اس قدر ہلکی ہوجاتی ہے کہ سانس لینا محال ہوجاتا ہے، دوسرے یہ کہ ریڈیو کی لہریں زمین تک نہیں پہونچتیں۔

خیر ہوا کے متعلق تو یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے ساتھ آکسیجن کی کافی مقدار ساتھ لے جائیں لیکن ریڈیو کی لہروں کو زمین تک پہونچانا ہنوز سمجھ میں نہیں آیا۔ بہرحال یورپ کے تمام ممالک میں تجربات ہورہے ہیں اور غالباً وہ دن دور نہیں جب انسان دس میل کی بلندی پر سات آٹھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑتا نظر آئے گا اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس تکمیل سے دُنیا میں اور زیادہ ہلاکت پھیلانے کا کام لیا جائے گا یا امن و سکون کی جدید دُنیا کی تعمیر کا!

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علحدہ علحدہ خرید فرمائیں تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں:

نگارستان	دو روپیہ
جمالستان	چار روپیہ
ترغیبات جنسی	تین روپیہ
شہاب کی	ایک روپیہ
استفسار و جواب ہر سہ جلد	نو روپیہ
معرکۂ سخن	ڈھائی روپیہ
مکتوبات نیاز	ڈھائی روپیہ
اُردو شاعری	دو روپیہ
ہندی شاعری	ڈیڑھ روپیہ
میزان کل	ستائیس روپیہ آٹھ آنہ

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیے میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

عقل کی حماقتیں

موجودہ زمانہ عقل و حکمت کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ انسان کی ذہنی ترقیوں کے نتائج کو دیکھکر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "خالِ رخِ زیبا" کی طرح ان عقلمندیوں میں حماقت کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔

امریکہ کی فراست و دانائی کے افسانے مشہور ہیں، لیکن انھیں کے ساتھ ایک یہ واقعہ بھی سُن لیجئے کہ ایک چار سال کا کُتا چار آدمیوں کو کاٹ لیتا ہے اور عدالت سے اس کے خلاف قصاص کا حکم صادر ہوتا ہے۔ ہر چند جانوروں کی ہلاکت کے احکام معمولاً عدالت اپیل میں نہیں جاتے لیکن اس کُتے کی مالکہ چونکہ بہت بااثر خاتون ہے اس لئے تیرہ مہینے سے مقدمہ بازی ہو رہی ہے اور اب یہ معاملہ عدالت اپیل کے سامنے آیا ہے جو امریکہ کی سب سے بڑی عدالت ہے۔

انسان اس میں کلام نہیں رسم و رواج کا بندہ ہے اور جو بات ایک بار اس کے ذہن میں سما جاتی ہے وہ مشکل ہی سے نکلتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کتے پر مقدمہ چلانا یا اس کے خلاف حکمِ قصاص پر عدالت اپیل میں چارہ جوئی کرنا بالکل تضیع اوقات ہے، لیکن چونکہ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ میں واہمہ پرستی کی بنا پر یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ جانوروں میں بھی خبیث روح سما جاتی ہے اور اُن کو بالکل انسان کی طرح ان کے افعال کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اس لئے ابتک اس کا اثر کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے۔

قدیم زمانہ میں ایک جانور کو انسان ہی کی طرح مجرم قرار دیکر سزا دینے کی مثالیں بہت پائی جاتی ہیں۔ بگلا بہت سیدھا جانور ہے اور لوگ اسے پالتے بھی تھے، لیکن سنہ ۶۶۶ء میں بہت سے بگلے اس جرم میں سزایاب ہوئے کہ انھوں نے بعض گھروں کو کچھ نقصان پہونچایا تھا۔ نویں صدی میں بعض چھچھوندروں پر سزائے موت کا حکم صادر کیا گیا کیونکہ وہ راتوں کو پریشان کرتی تھیں

فرانس، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کی تاریخ میں جانوروں کے خلاف مقدمہ چلانے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ اسی طرح اٹلی، بلجیم، اسپین، روس، ڈنمارک، انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی تاریخیں بھی اس قسم کی مثالوں سے خالی نہیں ہیں۔ زیادہ تر جانوروں پر قتل کا الزام قایم کیا جاتا تھا اور اس جرم کے مجرم اکثر و بیشتر سور ہوا کرتے تھے، کیونکہ اگلے زمانہ میں وہ بہت آزادی کے ساتھ انسانوں سے ملے جلے رہتے تھے اور انھیں اس قسم کے جرم کا زیادہ موقعہ ملتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سوائے کاشتکاروں کے دوسرے انسانوں کو بہت کم سور کے خطروں سے دوچار ہونے کا موقعہ ملتا ہے، تاہم شہروں میں کبھی کبھی ایسے واقعات سننے میں آجاتے ہیں کہ سور نے کسی انسانی بچہ کو کھا لیا۔

اس باب میں وحشی اور پالتو جانوروں کے درمیان بڑا فرق پایا جاتا تھا یعنی پالتو جانوروں کے خلاف شہری کی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جاتا تھا اور جنگلی جانوروں کے خلاف کلیسائی عدالتوں میں۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ پالتو جانوروں کو اپنے مالکوں کے سامنے جوابدہ سمجھا جاتا تھا اور وحشی جانوروں کو خدا کے سامنے جس کی نیابت کلیسا کرتا تھا چنانچہ کلیسائی عدالتیں جن جانوروں کے خلاف فیصلہ صادر کرتی تھیں ان میں سانپ، بچھو، چوہے، ٹیڑیاں وغیرہ بھی شامل ہوتی تھیں۔

جانوروں کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقعہ بھی دیا جاتا تھا یعنی ان کی طرف سے ایک انسانی وکیل بھی مقرر کر دیا جاتا تھا تاکہ اُن وحشی جانوروں کے باب میں جو گرفتار نہ ہو سکے ہوں وہ جوابدہی کرے۔ قاعدہ یہ تھا کہ اُن کے بھٹ یا غاروں کے سامنے سزا کا حکم پڑھکر سنا دیا جاتا تھا اور اگر انھیں گرفتار کر کے سزا دینے کی کوئی صورت نہ ہوتی تھی تو پھر بددعا کی سزا دیجاتی تھی۔

بعض اوقات جانوروں کو شہری عدالتوں میں بھی کھینچ بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ جنوبی جرمنی میں یہ قانون تھا کہ جس گھر میں کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو وہاں کے پالتو جانوروں کو بھی اعانت کے جرم میں سزا دیجاتی تھی ۔۔ قدیم روم میں ایک کاشتکار اس جرم میں ماخوذ ہوا کہ اس نے نشانِ حدبندی پر بھی ہل چلا دیا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے بیلوں کو بھی اعانت کا مجرم قرار دیکر سزا دی گئی۔

برازیل میں اب سے دو صدی پہلے چیونٹیوں کو اس جرم میں سزائے ہلاکت دی گئی کہ وہ ایک خانقاہ کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں اور لوگوں کے گھروں سے آٹا چرا چرا کر لیجاتی تھیں ـــــ سوئٹزرلینڈ میں ایکبار کسی مرغ پر انڈا دینے کا الزام قائم کیا گیا اور باقاعدہ اس کا مقدمہ عدالت میں پیش ہو۔ عدالت نے بہت چھان بین کے بعد حکم دیا کہ اسے زندہ جلا دیا جائے۔

ایران میں کتوں کے کاٹنے کے متعلق یہ قانون تھا کہ اگر وہ بھونکنے کے بعد کسی کو کاٹے تو خیر، ورنہ اسے سزائے موت ملنا چاہئے کیونکہ خدا نے اسے بھونک کر پہلے سے اپنے ارادہ کی اطلاع دینے کی اہلیت دی ہے ـــ جانوروں کو جن طریقوں سے سزائیں دیجاتی تھیں، ان کی نوعیت جرم کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتی تھی۔ موت کے حکم میں عام پر جانور کو سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں اسے اُلٹا لٹکا دیا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی گردن کاٹ دیجاتی تھی۔ اگر کبھی صرف سزائے موت ناکافی سمجھی جاتی تھی تو اس صورت میں اسے زندہ دفن کر دیتے یا جلا دیتے تھے ـ انسانوں کو شکنجہ میں کسکر اعترافِ جرم کرانے کا دستور تھا اور اصولاً جانوروں کا اس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے تھا لیکن کبھی کبھی جانوروں کو بھی اس عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا، چنانچہ آسٹریا میں ایکبار کسی کتے کو ایک سال تک شکنجہ میں رکھے جانے کی سزا دی گئی ـــ روس میں ایک بکری کو جلاوطن کر کے سائبیریا کی طرف بھیجدیا گیا۔

فرانس میں ایک گدھے کو صرف اسلئے رہا کر دیا گیا کہ اسکے چال چلن کے متعلق اچھی شہادتیں پائی جاتی تھیں۔ واشنگٹن (امریکہ) میں غیر ملکی سفیر کا کتا بھی ملکی قانون کی گرفت سے بالاتر سمجھا جاتا تھا ـــ افریقہ میں، گھڑیال، بھینسے، شیر اور ہاتھی پر اب بھی سزائے موت کا حکم صادر کیا جاتا ہے۔ یوروپ کی عدالتوں میں بھی بکریوں، گایوں، خچروں، بھیڑوں اور بیلوں کے مقدمات پیش کئے گئے اور انھیں سزائیں دگئیں، لیکن عجیب و غریب بات ہے کہ گھوڑے کو اکثر معاف کر دیا گیا کیونکہ اسے بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا ـــ قدیم یونان میں ایک خاص عدالت مقرر تھی جو نہ صرف جانوروں بلکہ بے جان چیزوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کیا کرتی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ حماقت کی مثال مشرق کی قدیم تاریخ میں ملتی ہے کہ ایک درخت کو اس جرم میں کاٹ ڈالا جاتا تھا کہ ایک آدمی کیوں اس سے گر کر ہلاک ہو گیا۔

سُہاگ

اس کی شادی ہوئے چند گھنٹے گزرے تھے اور وہ چوتھی کے لئے میکہ آئی ہوئی تھی کل تک وہ گھر کی سب سے زیادہ جاذب توجہ ہستی تھی مگر آج اس کے دولہا کا راج تھا۔ بڑے ہال میں جہاں گانا ہو رہا تھا وہ بالکل بیچ میں بیٹھا ہوا اپنی سالیوں اور سالوں سے ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ بوڑھے بچے سب ہی اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

میں دور کے ایک برآمدے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے اپنی عمر میں کبھی اتنے سگریٹ نہیں پئے تھے ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ انگلیاں پیلی پڑ گئی تھیں کلیجہ جلنے لگا تھا حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ زبان تڑخ گئی تھی مگر میں برابر سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ میں اس ساحل کے قریب خاموش بیٹھا تھا جس کو تموج خیز لہروں نے ایک ہی ٹکر میں پاش پاش کر دیا ہو۔ لہریں نظر سے اوجھل ہو گئیں تھیں مگر میں ان کو گننے کی کوشش کر رہا تھا۔

سامنے کا پردہ ہٹا۔ چار لڑکیاں شوخ رنگ کی ساریاں پہنے چہل قدمی کے لئے نکلیں میں لڑکیوں کو سماج کی لعنت سمجھنے لگا تھا اس لئے ان کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ دیکھا ——— ایک مرتبہ اور دیکھا ——— پھر دیکھا ——— کئی بار دیکھا ——— ان میں "وہ" بھی تھی ——— وہ جس کو اپنے شباب کا پہلی مرتبہ احساس ہوا ——— وہ جس کے سہاگ کی آج دوسری رات ہے ——— وہ جس کے حسین قدموں پر کسی نے سر رکھا تھا ——— وہ جو اپنے ماضی کو اب کسی طرح یاد نہیں کر سکتی ——— وہ جو اب کسی اور کو اپنے سے محبت کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی ——— وہ جو اپنے نئے پجاری کی خاطر خدا کو بھلا دے سکتی ہے۔

مجھے یہ یاد نہیں کہ میں اس درخت کے نیچے کس طرح پہونچ گیا۔ جہاں وہ اپنی بہنوں اور سہیلیوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے میں اسے اچھی طرح نہ دیکھا۔ اس کے ساتھی جا چکے تھے۔ میں نے دو دن پہلے اس کی تصویریں واپس کرنے اور خط جلا دینے کی خواہش کی تھی جس کی اس نے شکایت کی۔ میں نے کہا "تصویریں اب بے جان ہو گئی ہیں ان میں بولنے کی سکت نہیں میں انھیں رکھکر کیا کروں گا۔" اس نے جواب دیا "مجھے خوش کرنے کے لئے رہنے دیجئے۔" جی میں آیا کہہ دوں "میں اس خدا کو بھی خوش نہیں کر سکتا جو مجھے رنجیدہ دیکھکر خاموش رہ سکتا ہے۔" مگر قوت گویائی سلب ہو گئی تھی۔ میں نے کہا "محض تمہارے کہنے پر میں نے کل اور آج کی تقریبوں میں شرکت

کی یہ تمہاری ہی مرضی تھی کہ میں نے اپنے گھر کو جلتا ہوا دیکھا اور خاموش رہا۔ تمہاری ہی خواہش تھی کہ کل میں نے تمہارے بھائی کے زہر بھرے کچوکے سہے۔"

اس کے بھائی نے اُٹھتے بیٹھتے جو طعنے دئے تھے ان کی تفصیل میں اس لئے بیان نہیں کر سکا کہ وقت کم اور خطرات زیادہ تھے۔ اس نے پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر محض اس ڈر سے کہ میری زہریلی سانسیں خود اس کو جلا کر خاکستر نہ کر دیں، میں نے انکار کر دیا۔

وہ بالکل تنہا تھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ہمیشہ یاد رکھے گی کبھی نہیں بھولیگی۔ اس نے مجھے اپنی ایک انگوٹھی پہنائی میں نے اس کے گلے میں ایک ہار ڈالا ——— یہ آخری دھوکہ تھا جو خود اس نے اور میں نے اپنے کو دیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ مجھے بہت جلد بھلا دے گی مگر میں نے ایک بار خود کو دھوکہ دیا اور اس سے وعدہ لیکر خوش ہو گیا۔ میری نام نہاد مسرت کی یہ مختصر گھڑی ختم اس طرح ہوئی کہ اس کی چھوٹی بہن نے بھاگتے ہوئے آکر کہا اس کا دولہا ہماری طرف آ رہا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ پکڑ لئے، وہ چھڑانے کے لئے تلملانے لگی میری گرفت اور سخت ہو گئی اس وقت میرے دل میں عجیب احساسات اور جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ میں سماج کے گندہ نقاب کو اُلٹ دینا چاہتا تھا۔ میں سوسائٹی کی گندگی اُچھال کر مصنوعی پاکیزگی کے وہم کو دور کرنا چاہتا تھا مگر میں جس کشمکش میں تھا اس پر قابو نہ پا سکا میں اس قطعی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا کہ آیا اس نے مجھے دھوکہ دیا ہے یا سماج نے خود اسکو دھوکہ دیا ہے۔

وہ ہاتھ چھڑانے کے لئے انتہائی کوشش کرنے لگی۔ مجھے اس سُہاگ پر رحم آگیا جو سماج نے اس کو چند گھنٹے پہلے دیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دئے اور وہ تیزی سے دوسری طرف چلی گئی ——— جاتے وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے نازک کاندھوں پر سماج کا وزنی اور گندہ جنازہ لئے ہوئے آسمان کی طرف جا رہی ہے اور قدرت زمین پر کھڑی ہوئی اس کی بے بسی پر کھسیانی ہنسی ہنس رہی ہے۔

مرزا اظفر الحسن بی۔ اے

سوشل ڈراما

نشا

یعنی ایک دُکھیا بہن کی زندگی کا تماشہ ——— از کشن پرشاد کول ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔ قیمت عہ ر

منیجر نگار لکھنؤ

پروپیگنڈا

اجتماعی نفسیات کی روشنی میں

"اگر پروپیگنڈا ہوشیاری سے لگاتار کیا جائے تو لوگ جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت کہنے پر راضی ہو سکتے ہیں"

ہٹلر کا یہ جملہ پروپیگنڈے کے نقصانات کی پوری طرح غمازی کر رہا ہے۔ نشر و تبلیغ ایک اجتماعی قوت ہے اور اس کا کام ترغیباتِ ذہنی کا سامان فراہم کرنا ہے اس لئے یہ اوزار اُن لوگوں کے ہاتھوں بڑی تباہی پیدا کر سکتا ہے جن کا اُصولِ زندگی صرف ہوس مندی اور جاہ طلبی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ پروپیگنڈا نیک اور اچھے کاموں کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔ وہ فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ اس کا اچھا یا بُرا استعمال اس کو نیک و بد کی صفات سے متصف کر سکتا ہے۔ جہاں ہم اس سے حرص و آز کی آگ بھڑکانے اور مخالفین کو بدنام کرنے کے کام لے سکتے ہیں وہاں اس کو بین الاقوامیت کی ترویج، امن و سکون کی تبلیغ اور زندگی کی درستی اور اصلاح کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

پروپیگنڈا کوئی نئی چیز نہیں ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں ابتدائے تاریخ سے انسانی زندگی پر اثر انداز رہا ہے لیکن عصرِ حاضر میں اس سے جس باقاعدہ اور متنوع طریقہ سے کام لیا گیا ہے اس کی زمانۂ گزشتہ میں مثال نہیں ملتی۔ سیاسیات، اجتماعی نفسیات اور سائنس کی ایجادات نے اس کے اثرات کو ہمہ گیر بنا دیا ہے اور اس موجودہ وسیع و عریض دنیا کی کوئی تحریک ایسی نہیں ہے جس کو کامیاب بنانے کے لئے اس حربہ کو کام میں نہ لایا جاتا ہو۔

پروپیگنڈا وسیع معنوں میں سائنس کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس فن کی تمام جزئیات کو کسی محدود ضابطہ اور قاعدہ کا پابند بنایا جا سکتا ہے اس کے دائرۂ عمل کی وسعت و پہنائی کا اندازہ کرنا آسان نہیں ہے اس لئے کہ وہ واقعات کے تاثراتِ نفسی سے بحث کرتا ہے اور اس ہر دم رواں دواں زندگی میں واقعات لمحہ بہ لمحہ اور لحظہ بہ لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔ پروپیگنڈا کرنے والا چند موٹے موٹے اُصولوں کو سامنے رکھتا ہے اور جتنا وہ اُن کو واقعات و حادثات پر منطبق کرتا جاتا ہے اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے۔

فنِ نشر و اشاعت کی دو موٹی تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہ سیدھا اور کھلا ہوا طریقہ ہے جس میں ہر مخالفت کو مخالفت ہی کے نام پر شدت کے ساتھ دبایا جاتا ہے۔ دوسرا وہ لطیف طریقہ ہے جس میں تحریکات ذہنی اور اعمال توجہ

سے کے ذریعہ رفتہ رفتہ مخالفانہ خیالات کو زائل کر دیا جاتا ہے اور وہ شخص اس خوشنما فریب عقلی میں مبتلا رہتا ہے کہ یہ تبدیل شدہ رائے اسی کی دماغی فکر کا استنباطی اور استخراجی نتیجہ ہے۔ ان دونوں طریقوں کے الگ الگ دائرہ عمل ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ موثر ہیں۔ لیکن موخرالذکر طریقہ میں سب سے زیادہ ترقی و عمل کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ اپنے خیالات کو براہ راست طریقہ سے منوانے کے لئے سیاسی گروہ بندی ضروری ہے اور داعی کا اسی طاقتور جماعت کا ایک موثر رکن ہونا بھی لازمی امر ہے شدید اختلافات کی صورت میں پروپیگنڈے کا ایسا طریقہ زیادہ موثر ہوگا جس میں ترغیب دینے یا مایل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہو۔ اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی ہی کوشش سے اس نتیجہ پر پہونچا ہے۔

ذیل میں نشر و اشاعت کے چند عام اصولوں سے بحث کی گئی ہے جن میں در اصل داعی کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔
لیکن اس امر سے چشم پوشی نہ کرنا چاہئے کہ وہ بڑی حد تک امواجِ حوادث کے رحم و کرم پہ ہوتا ہے۔ اس کا پروپیگنڈا کتنا ہی منظم، مسلسل، اور صناعانہ تکمیل کا حامل کیوں نہ ہو، محض ایک مخالف موج اس کی ساری تعمیر کو الٹ سکتی ہے۔ خارجی تبدیلیوں کے علاوہ داخلی تغیرات بھی انسانی ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں۔ پبلک معاملات میں جذبات کی نیرنگی بڑی اہمیت رکھتی ہے ممکن ہے ایک شخص جو کل محبوبِ خلایق تھا آج مردود قرار دیا جائے اور ایک تحریک جو آج بیحد مقبول ہے کل کو اسکے متعلق کوئی گفتگو بھی کرنا پسند نہ کرے، سوسائٹی یا جماعت کی نفسیاتی حالت شبنم کی زندگی سے زیادہ ناپائیدار ہے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا خیالات کا رخ بدل سکتا ہے۔ اس لئے نشر و تبلیغ کرنے والے کو ذہنی کیفیت کے متعلق کبھی استحکام کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہئے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی پالیسی اور عوام کی نفسیات میں ہم آہنگی اور مطابقت پیدا کر دے اور ایسا "ہم رنگِ زمین" دام بچھائے کہ قوتِ امتیاز سلب ہو جائے اور اسیری و گرفتاری کے امکانات یقین کے درجہ تک پہونچ جائیں۔ اگر داعی ایسا نغمہ چھیڑ سکتا ہے جو بالکل موقع اور موسم کی چیز ہو تو پھر اسکا جذبات پر قابو پا لینا مشکل نہیں ہے۔ ذیل کے اصول مذکورۂ بالا حد شناسیوں کے بعد بیحد مفید ثابت ہو سکتے ہیں:-

پروپیگنڈے کا سب سے پہلا اصول تکرار و اعادہ ہے۔ پبلک کا حافظہ نہایت کمزور ہوتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ایک بات کو بار بار اور مختلف طریقوں سے دہرایا جائے۔ ایک چیز جو کل تک بالکل گوشہ گمنامی میں پڑی تھی وہ آج موٹی موٹی سرخیوں کے ذریعہ نہایت آب و تاب کے ساتھ اخبارات میں جلوہ گر ہو سکتی ہے لیکن اگلے روز ممکن ہے کہ وہ پھر طاقِ نسیاں کی زینت بن جائے۔ موجودہ دنیا کی تیز رفتاری اس درجہ سہو آفریں ہے کہ اکثر واقعات اپنی پوری اہمیت کے انکشاف سے قبل، ذہن انسانی سے محو ہو جاتے ہیں۔ مسٹر ایڈن کی وہ تقریر جو انھوں نے اطالوی مسئلہ پر ۲۶ فروری ۱۹۳۵ء کو دار العوام میں کی تھی آج کتنے لوگوں کو یاد ہے؟ لیکن اسوقت وہ آفتاب کی روشنی کی طرح تمام کرۂ ارض پر پھیلی۔ ہر شخص نے اس کو پڑھا، سیاسی ایوانوں میں اس پر بحثیں ہوئیں۔ بال کی کھال نکالی گئی، تبصرے اور تنقیدیں ہوئیں۔ لیکن آج اس کی حیثیت تقویم پارینہ سے زیادہ نہیں ہے۔ حال کے اخبارات بھوول سنیاسی کے

مقدمہ سے بھرے پڑے ہیں لیکن ایک مہینہ بعد ہمیں یہ بھی یاد نہ رہے گا کہ بباتی دیوی کون تھی؟ اور اس کے کیا مطالبات تھے؟ اِن وجوہ کی بنا پر داعی کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ نسیانِ عوام کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے کام کی باتیں بار بار دہراتا رہے تکرار و اعادہ میں تنوع بہت ضروری ہے۔ ورنہ یکرنگی اور یکسانیت بہت جلد پبلک کو اُکتا دے گی بعض لوگ تو اس معاملہ میں اتنے جری ہوتے ہیں کہ تنوع کی خاطر جسمانی تکلیف کی بھی پرواہ نہیں کرتے آرنولڈ مانزلے کے اوپر (جو غالباً آج کل نظر بند ہے) ایک مرتبہ تقریر کے دوران میں پتھروں سے حملہ کیا گیا۔ مخالف اخبارات نے بہتیرا چاہا کہ اس واقعہ کا تفصیل سے تذکرہ نہ ہو اس لئے کہ اس احمقانہ فعل نے فسطائیت کو صفحۂ اول کی خبروں میں جگہ دیدی تھی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا۔ ہر اخبار کو اس حادثہ کا تذکرہ کرنا ہی پڑا۔ اس بات سے یہ ضرور واضح ہوتا کہ ترجیعی اور تکراری پروپیگنڈے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں "خبر کا لطف" ہمیشہ موجود رہے۔

پروپیگنڈے کا دوسرا اہم اُصول یہ ہے کہ نظریات و تصورات سے بحث نہ کی جائے۔ عامی کی طبیعت تخصیص پسند ہوتی ہے، وہ واقعات اور شخصیتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور عموماً ایک مخصوص اور منفرد واقعہ سے تعمیم کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس لئے داعی اور مبلغ کو نظری دلایل پیش نہیں کرنا چاہئے، بلکہ چند خاص واقعات یا حالات کو اس طرح پیش کرنا چاہئے جن سے اس کے مفید مطلب کوئی بات نکلتی ہو۔ لیگ اگر کانگریس کی معاندانہ روش کو ثابت کرنے کے لئے تہذیبی، تاریخی اور سیاسی دلایل پیش کرے اور وہ علمی اعتبار سے کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں، مگر ایک عام آدمی اُن سے زیادہ متاثر نہیں ہوسکتا۔ لیکن اکابر کانگریس کا اُردو کے ساتھ دشمنانہ سلوک یا بسوا کے مقدمہ کی مثال غالباً شیدائیانِ کانگریس کے پندار کو کافی صدمہ پہونچا سکتی ہے۔ اسی طرح کانگریس اگر ممالک غیر میں اپنا پروپیگنڈا کرنا چاہتی ہے تو لوگ اس کی تجاویز اور سیاسی فلسفہ سے زیادہ گاندھی جی کی سیرت اور حالات میں دلچسپی لیں گے اور اس طرح بالواسطہ طور پر کانگریس کے اُصولوں کی نشر و تبلیغ ہو جائے گی اس لئے کہ دراصل ساری کارگاہ کانگریس گاندھی جی ہی کے بنیادی اُصولوں پر قایم ہے۔ اور ہندوستان میں یہ اُنھیں کی شخصیت ہے جو کانگریس پر "شجرِ سایہ دار" کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ اسی طرح چین کے لوگ اگر یہ چاہیں کہ "میثاقِ نُہ اقوام" کی تفصیلات سے ہر شخص باخبر ہو جائے تو یہ ممکن نہیں، ہاں اگر وہ مفلوک الحال چارلی سنگ کی داستان، جس نے چین کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا دُنیا کے سامنے پیش کریں گے تو ہر شخص دلچسپی سے پڑھے گا۔

تقریر کا بھی یہی اُصول ہے۔ کامیاب مقرر صرف وہ ہو سکتا ہے جو عوام کے ذوق و رجحان کا لحاظ رکھے اور خاص بات سے عام نتیجہ نکالے۔ مقرر کی سعی یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کی تقریر سے صرف چند اعلیٰ تعلیم یافتہ دماغ ہی لطف اُٹھائیں بلکہ مجمع کی اکثریت مستفید ہو سکے۔ لائڈ جارج، چرچل اور ہٹلر کی تقریروں کی کامیابی کا راز صرف اُن کی سادگی، آسان تشبیہات اور توضیحی اندازِ بیان میں مضمر ہے۔

بعض اوقات مخالفین کی غلطیوں سے بھی فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔ پچھلی جنگ عظیم میں "نرس کیول" کے قتل نے جرمنوں کے خلاف کافی بیزاری پھیلا دی تھی۔ حال میں ٹراٹسکی کا دردناک قتل بھی استالن کے خلاف منافرت کے جذبات اُبھار سکتا ہے سینٹ جون کو جس طرح نذر آتش کیا گیا اس کا انجام صرف یہ ہوا کہ فرانس میں حب وطن کی عفریت پیکر موجیں امڈ پڑیں اور انھوں نے ملک کو دشمنوں سے بالکل پاک وصاف کر دیا۔

کارٹون بھی پروپیگنڈے میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ پچھلی لڑائی میں انھوں نے عوام کے قلب و دماغ کو مسخر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ جس زمانہ میں جرمنوں نے غیر جانبدار ملکوں کے جہازوں کو تباہ کرنا شروع کیا، اسوقت ایک کارٹون نکلا تھا جس میں یہ دکھلایا گیا تھا کہ چند جرمن آب دوز کشتی میں بیٹھے ہوئے جہازوں کو برباد کرنے کی فکر میں مصروف ہیں۔ ناگاہ ایک کشتی نمودار ہوتی ہے جس پر حضرت مسیح سوار ہیں۔ جرمن اسے دیکھ کر بالاعلان کہتے ہیں "یہ کشتی غیر جانبدار معلوم ہوتی ہے اسے تباہ کردو"۔ شنکر کے کارٹونوں نے کانگرس پالیسی کی نشر و اشاعت میں کتنا مہتم بالشان حصہ لیا ہے اس کا صحیح اندازہ آیندہ مورخ ہی کر سکے گا۔ یوم نجات و تشکر کے موقع پر اس کا ایک کارٹون نکلا تھا جس میں مسٹر جناح کو ایک جوان بیوہ کی حیثیت سے دکھلایا گیا تھا جو شوہر کی ناگہانی موت کے باعث شدت رنج و غم سے بالکل پتھر کی مورت ہو کر رہ گئی تھی۔ نیچے ٹینی سن کی مشہور نظم کا ایک مصرع لکھا تھا کہ "اسے رو کر اپنے آپ کو ہلکا کرنے دو، ورنہ یہ درد و کرب کا سیلاب اسکی زندگی ہی کو لے ڈوبے گا"۔ شاید یہ اسی قسم کی قلم کاریوں کا نتیجہ تھا کہ مسٹر صدیقی بھی جناح صاحب کے اس فعل کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہوئے۔

پروپیگنڈے کا ایک اہم اُصول یہ ہے کہ وہ حقیقت اور سچائی سے قطعاً مبرا نہ ہونا چاہئے۔ جرمنوں کو رائی کا پہاڑ کرنے میں یدطولیٰ حاصل ہے۔ سوڈیٹن جرمنوں کے ساتھ چیکوسلوویکیہ کا برتاؤ غیر ہمدردانہ اور ناخوشگوار تھا۔ لارڈ رنسیمن نے بھی ۱۲ ستمبر کے خط میں جو انھوں نے وزیر اعظم برطانیہ کو لکھا تھا اس کا اعتراف کیا ہے: "ایک مخالف قوم کا حکومت کرنا بڑی سخت اور تکلیف دہ بات ہے۔ میں ان تاثرات کے ساتھ واپس آیا ہوں کہ سوڈیٹن علاقوں میں چیکوسلوویکیہ کی بیس سالہ حکومت اگر بالکل ظالمانہ اور سفاکانہ نہیں رہی تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس نے افلاس فہم و تدبر اور قدرے غیر رواداری کا ثبوت دیا"۔ اس معمولی اور خفیف بنیاد پر جرمن وزارت اور اخبارات نے بہتان و افترا کا وہ فلک بوس مینار تعمیر کیا جسکے تباہ کن اثرات کا اندازہ کرنے کے لئے اعلان پراگ کے صرف یہ الفاظ کافی ہیں: "چیک امن وسکون کے لئے اسوقت وہی قربانی پیش کر رہے ہیں جو کسی وقت مسیح نے پیش کی تھی"۔

پروپیگنڈے کا ایک اُصول یہ بھی ہے کہ اس میں جہاں تک ممکن ہو اختصار برتا جائے، لمبی چوڑی تقریریں یا طویل مضامین، عام پبلک کے نزدیک درخور اعتنا نہیں ہوتے، اُن کے لئے مختصر پیراگراف، چھوٹے چھوٹے مضامین، چست فقرے اور پرزور نعرے، زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ انقلاب فرانس کا "حریت، مساوات، اخوت" کا نعرہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ امریکہ میں سونے اور چاندی کے سکوں کو یکساں رواج دینے پر جو جھگڑا چلا تھا اس کا بھی یہ نعرہ کبھی فراموش

نہیں کیا جا سکتا:۔ "بنی نوع انسان کو سونے کی صلیب پر مصلوب کرنا ممکن نہیں ہے"

بعض اوقات دشمن یا مخالف کوئی ایسا جملہ ادا کر دیتا ہے جس سے داعی بڑا فایدہ اُٹھا سکتا ہے اور اسے نعرۂ تحریک بھی بنا سکتا ہے۔ پچھلی جنگ میں جرمنوں نے انگریزی فوج پر طعنہ کیا تھا کہ یہ "چھوٹی اور حقیر فوج" کیا لڑے گی۔ اس جملہ نے انگریزوں کو نئے سپاہی بھرتی کرنے میں شاید وقت کی مصلحت اندیشیوں سے زیادہ مدد دی۔ گاندھی جی کا یہ جملہ جو انھوں نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے اجلاس میں فرمایا تھا کہ "اُردو قرآن کے رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اسے پھیلایا اور بڑھایا، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں"۔ ہر اُردو سے محبت کرنے والے کے دل میں نشتر کی طرح پیوست ہو گیا اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو کے تحفظ و بقا کے لئے اس عرصہ میں جو تھوڑی بہت کوششیں ہوئیں وہ سب اسی جملہ کی مرہون ہیں۔

پروپیگنڈے کا ایک اہم اُصول یہ ہے کہ داعی کے سامنے ایک متعین مقصد ہو اور وہ برابر اسی کی جانب بڑھتا رہے۔ بغیر صحیح مطمح نظر کے ساری کوشش اسی طرح بیکار اور لایعنی ہے جس طرح بلا شست کے کوئی تیر فضا میں چھوڑ دیا جائے اس میں شک نہیں کہ پروپیگنڈا کرنے والے کو منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے بہت سے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے وہ ایک سائنس داں کی طرح خوش نصیب نہیں ہے جو نتائج و اثرات کا بالکل صحیح اندازہ کر سکتا ہے اور انھیں کی روشنی میں اگلا قدم بڑھاتا ہے داعی اور مبلغ کا معاملہ برعکس ہے۔ اس کی منزلِ مقصود خواہ دستِ شوق سے متصل اور نگاہوں سے بالکل قریب ہی کیوں نہ ہو لیکن نشر و اشاعت کرنے والا شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اتنا قریب آگیا ہے اس لئے کہ اسکے پاس ایسا کوئی آلہ نہیں ہے جس سے وہ پبلک کے تاثراتِ ذہنی کا بالکل صحیح طور پر اندازہ کر سکے۔ اخبارات ضرور رہنمائی کر سکتے ہیں لیکن ایسا بھی وقت آسکتا ہے جب اخبارات اکثریت کے رجحانات کو نہ پیش کریں یا اُن کے اظہار میں کوتاہی کریں۔ اس لئے داعی کے لئے "بڑھے چلو" ہی کا اُصول مناسب ہے جب تک کہ وہ منزلِ مقصود پر پہونچکر اپنی کامیابی پر فخر کرنے کا اہل نہ بن جائے۔ ایسے ملکوں میں جہاں کی اجتماعی زندگی "یک رنگ و یکساں" قسم کی ہے وہاں داعی کا کام ذرا ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے ملکوں میں ذہنی اختلافات کم ہیں اور وہاں یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص محرک کا ردِعمل یہ یا اس قسم کا ہوگا۔ لیکن ایسے ممالک میں جہاں معقول اور جایز اختلافات برکت کی چیز سمجھے جاتے ہیں، داعی کو لغزشوں، غلطیوں اور غیر یقینی باتوں کی رعایت کرتے ہوئے، بڑی مستعدی اور پامردی سے اپنے مقصد کی جانب بڑھنا چاہئے۔

پروپیگنڈے کا ایک اُصول یہ بھی ہے کہ اصل مقصد پر ایک خوشنما نقاب ڈال دیا جائے۔ اس کا فایدہ یہ ہے کہ تبلیغ کا موضوع زیادہ محرکِ خیال اور معنی خیز بن جاتا ہے اور اس میں شک و شبہ کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص نگار یا جامعہ میں انشورنس کے متعلق بڑے شوق سے پڑھے گا لیکن وہی بات اگر ایک انشورنس ایجنٹ بیان کرے گا تو اسے کوفت ہونے لگے گی اور وہ اسے ایجنٹ کے پروپیگنڈے اور ہم خیال بنانے کی کوشش پر محمول کرے گا۔

۱۹۳۷ء میں جرمنی کی اس انجمن نے جس کا مقصد ممالکِ غیر میں قومی اشتراکیت کی تبلیغ ہے آسٹریا کے ادبی۔۔۔۔۔ لیم پوسٹر

خرچ کئے اور ایسا ہمرنگِ زمین دام بچھایا کہ اگلے سال یہ سارا روپیہ وصول ہوگیا - اسی طرح تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنسوں کی ناکامیابی میں اسلحہ سازوں کی ریشہ دوانیوں کو بہت دخل تھا جنھوں نے اپنے پروپیگنڈے کے ذریعہ ملکی دفاع پر بیحد زور دیا - جنیوا کی بحری تخفیفِ اسلحہ کانفرنس کے سلسلہ میں یہ واقعہ بہت دلچسپ ہے کہ اس کے دو سال بعد ایک شخص مسٹر شیریر نے ممالکِ متحدہ امریکہ کی جہاز بنانے والی تین بڑی بڑی کمپنیوں پر اس وجہ سے دعوے کیا کہ انھوں نے مسٹر شیریر کے تمام مطالبوں کو ادا نہیں کیا تھا جو کانفرنس کو ناکام بنانے کے عوض میں اُن پر واجب تھا اسی طرح اشتراکیوں نے "امن پسندی" کے پردہ میں بہت کچھ کارروائیاں کی ہیں اور بہت سے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا ہے - لڑائی کے زمانہ میں یہ نقاب پوش ہستیاں، جن کا کام نشر و تبلیغ ہے ملک کے لئے بڑی خطرناک بن جاتی ہیں - موجودہ زمانہ میں جنگ عجیب و غریب چیز بن گئی ہے اس میں محض سپاہی نہیں لڑتے بلکہ ساری قوم - اُس کا ایک ایک فرد برسرِ پیکار ہوتا ہے - اور محض طیارہ و تفنگ ہی سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ ریڈیو اور اخبارات بھی اتنا ہی اہم کام کرتے ہیں - نپولین کہا کرتا تھا کہ میں چار مخالف اخبار والوں سے بہ نسبت دس ہزار سپاہیوں کے زیادہ ڈرتا ہوں - آج اس جملہ کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے -

پروپیگنڈے میں وقت کا بھی لحاظ ضروری ہے - لائڈ جارج کا یہ طریقہ کہ ہر سنیچر کی سہ پہر کو اہم موضوع پر تقریر کیجائے جرمنی میں بہت پسند کیا گیا اس میں فایدہ یہ تھا کہ اتوار کے روز سب لوگ اسے فرصت کے ساتھ اخباروں میں پڑھ سکتے تھے اور اخبار بھی سنڈے ایڈیشن میں کافی جگہ ہونے کے باعث اسے پہلے صفحہ پر شایع کرتے تھے - پچھلی جنگ میں بھی وقت اور موقع کا بڑا لحاظ رکھا گیا - ایک بری خبر اسوقت تک کے لئے روک لی جاتی تھی جب تک کہ فتحیابی کی کوئی خبر اس اثر کو زایل کرنے کے لئے موجود نہ ہو -

بعض اوقات پروپیگنڈے میں "کم گوئی" بھی مفید اور ضروری ہے جب مخالف غالب ہو اُسوقت داعی کی خاموشی فضول گوئی کی نسبت زیادہ مناسب ہے - اگر اس کا جواب الجواب زیادہ پراثر نہیں ہے تو اس کو بری طرح پسپا ہونا پڑیگا - ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ وہ کچھ دیر ضبط و تحمل سے کام لے اور پبلک کو موقع دے کہ وہ مخالف کے دلایل کو بھول جائے اس کے بعد داعی کو بہت جلد کسی دوسرے محاذ پر جوابی حملہ کرنا چاہئے - اس میں دو فایدے ہیں ایک تو یہ کہ لوگوں کی توجہ پچھلی خفت اور ناکامی کی طرف سے ہٹ جائے گی اور دوسرا یہ کہ مخالف اپنی پچھلی فتح سے پورا فایدہ نہیں اُٹھا پائیگا اور وہ جلد ہی "مدافعانہ" جنگ قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گا -

یہ ہیں پروپیگنڈے کے عام اُصول - ان کو دیکھ کر ہم بمشکل سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ موجودہ فنِ نشر و اشاعت میں جھوٹ کا عنصر کتنا شامل ہے اور اس کی زہر افشانیاں کتنی قیامت خیز ہیں - جنگ کے زمانہ میں سب سے پہلی چیز جس پر ضرب کاری لگتا ہے "حق و صداقت" ہے - جرمنی میں جہاں پرائیوٹ اُصول و عقاید کوئی معنی نہیں رکھتے بلکہ ریاست ہی ایک کل ہے اور ہر چیز اس کا جزوِ محکوم - جھوٹ بھی اُصولِ سیاست میں داخل ہو گیا ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں

بھی جاتی - ہٹلر نے جو وعدہ بھی اس لئے کرتا ہے کہ اس کا ایفاء نہ کیا جائے، کتنی مرتبہ جارحانہ اقدام سے توبہ کی اور قیام امن کا مستحکم وعدہ کیا لیکن اس کا نتیجہ عالمگیر جنگ کی صورت میں نمودار ہوا جس کی شعلہ باریوں نے آدھے سے زیادہ یورپ کو تباہ و برباد کر رکھا ہے۔ حبش کے خلاف (مسولینی کا بیان یہ ہے کہ) اس کو مہذب بنانے اور ظالمانہ اقدامات کی سزا دینے کے لئے فوج کشی کی گئی - جاپان نے آج تک چین کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کیا- بلکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ باہم امن و مصالحت کی کوششیں کر رہا ہے - اس بے پناہ طغیانِ کذب و افترا کی روک تھام محض ہمارے ہوش و گوش کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم عقل و دانش کو زنگ نہ لگنے دیں اور اُن سے برابر کام لیتے رہیں-

خواجہ احمد فاروقی - بی - اے

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۲ء
(غالب نمبر)- غالب شوخ نگار (نثر و نظم) کی حیثیت سے، صفحات ۱۵۶ معہ تصویر غالب (رنگین) قیمت ایک روپیہ (عہ ر) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۵ء
(اُردو شاعری نمبر)- اُردو شاعری کی تاریخ اور ہر زمانہ کے شعراء پر نقد و تبصرہ اور انتخاب کلام جو ہر حیثیت سے مکمل ہے صفحات ۲۳۶- معہ بعض صاحب قلم کی تصاویر کے ساتھ جس میں اڈیٹر نگار کی قلمی تصویر بھی شامل ہے - قیمت دو روپیہ (عار) علاوہ محصول

جنوری سنہ ۳۶ء
(ہندی شاعری نمبر) ہندی شاعری کی تاریخ اور مستند شعرا کے کلام پر تبصرہ اور انتخاب کلام صفحات ۱۹۲ قیمت عہ

جنوری سنہ ۳۷ء
ڈرامہ اصحاب کہف - خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے - صفحات ۱۴۴ - قیمت عہ ر - علاوہ محصول-

جنوری سنہ ۳۸ء
تاریخ اسلامی ہند- یہ تاریخ جس دقت نظر اور کاوش تحقیق کے بعد مرتب کی گئی ہے، اُس کا اندازہ آپ کو مطالعہ کے بعد معلوم ہوگا- صفحات ۱۵۲ - قیمت ہر - علاوہ محصول-

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر) اسکے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ- صفحات ۱۶۴ - قیمت ایک روپیہ - علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر) بعض عنوانات :- نظیر کا مسلک - شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ صفحات ۱۲۸ - قیمت عہ ر علاوہ محصول-

مینیجر نگار لکھنؤ

اعترافِ گناہ

سیاہ رنگ کے بورڈ پر سفید حرفوں سے لکھا ہوا تھا۔۔ "کنفیشن روم"

اسے کسی نے بتا دیا تھا کہ اس کمرے میں مسیح کے پیرو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ قلب میں صفائی ہو تو گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ارادوں میں استقلال ہو تو نجات مل جاتی ہے۔ مسیح کا مذہب قلب کو صفائی بخشتا ہے اور ارادوں میں استقلال پیدا کر کے نجات عطا کرتا ہے۔

وہ بورڈ کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھی، اُس کی آنکھوں نے خزاں کے بیس موسموں کو دیکھا تھا۔ اُن میں تجسس کی ایک عجیب تڑپ موجزن تھی۔ اس تڑپ نے اُس کو کسی چیز کے والہانہ احترام سے بے نیاز کر دیا تھا، اُس کے خزاں دیدہ چہرے میں بہار کی سی جاذبیت تھی۔ اُس کی بڑی بڑی جادو کر دینے والی آنکھوں کے نیچے اُس کی تنگ ٹھوڑی نے اُسکے چہرے کو غیر مناسب طور پر یکلخت ختم کر کے اُس کو ایک جلدی ہتھیار ڈال دینے والی عورت بنا دیا تھا۔ لیکن اُس کی خاموشی اس کمزوری کو پورا کرنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

سامنے کی دیوار پر عیسٰے کے صلیب پر چڑھائے جانے کا واقعہ روغن کیا ہوا تھا؛ شام کی زردی مایل کمزور روشنی میں ہاتھوں سے نکل کر پاؤں تک پہونچنے والا گہرا سرخ رنگ اصلی خون معلوم ہوتا تھا، اس سے فضا کسی قدر ڈراؤنی ہو گئی تھی، دوسری دیواریں بالکل سادہ تھیں۔ سامنے دائیں کونے میں ایک دروازہ تھا، دائیں اور بائیں دیوار سے دو فٹ اور سامنے کی دیوار سے پانچ فٹ کے فاصلے پر سامنے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک جنگلہ تھا، جنگلے کے اندر ایک چوکی پر سیاہ لبادہ پہنے ہوئے پادری بیٹھا تھا، اُس کے سامنے چاندی کے فریم میں انجیل رکھی ہوئی تھی، وہ پڑھ رہا تھا۔

وہ دروازے کے اندر داخل ہو کر کمرے کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

پادری کو معلوم ہو گیا تھا، کوئی اندر آیا ہے، لیکن اُس نے اپنا سر اوپر نہیں اُٹھایا، وہ اعتراف کے وقت اسی طرح اپنا سر نیچے رکھنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ جس کو اعتراف کرنے والے کے سنجیدہ جذبات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہئے

وہ حیران تھا، اعتراف کرنے والا آگے کیوں نہیں آتا۔

وہ حیران تھی، پادری اُس کو آگے کیوں نہیں بُلاتا۔

پادری نے ایک لمحے کے لئے اپنا سر اُٹھایا، اور نسوانی حُسن کی ایک دلکش تصویر دیکھ کر اُس نے بے پروائی سے اپنا سر جھکا لیا، مذہب انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھاتا ہے، مذہب گناہوں کی طرف دعوت دینے والی تمام چیزوں کو نفرت سے دیکھتا ہے، اگر گناہوں کی طرف دعوت دینے والی چیز انسان ہو، تو انسان کیا کرے۔ لیکن پادری انسان نہیں اُس نے قابلِ نفرت چیزوں کو نفرت سے دیکھنا چھوڑ دیا ہے، یعنی ایسی چیزیں اُس کے دل میں نفرت کا خیال پیدا کردیں، تو وہ اُس کو چھپانا جانتا ہے۔ اگر وہ ایک لمحہ اور اُس عورت کی طرف دیکھتا رہتا تو اُس کی آنکھوں سے حقارت ظاہر ہو جاتی ۔۔ وہ بولا:۔

"بیٹی! آگے آجاؤ!"

وہ پس وپیش کے انداز میں آگے بڑھی اور جنگلے تک پہنچ گئی ۔

"مقدس کتاب کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جاؤ، ہاتھ جوڑو، آنکھیں بند کرلو، سنجیدگی سے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو، آسمانی باپ تم کو بخش دے گا"

وہ اُسی طرح اپنے داہنے ہاتھ سے جنگلے کو پکڑے کھڑی رہی:

"محترم باپ! اس سے کیا فائدہ ہے؟"

پادری نے مجبور ہو کر ایک بار پھر اُس کی طرف دیکھا:

"لڑکی! تیرے سوال نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ کیا تیرے ماں باپ نے تجھے کچھ نہیں بتایا؟"

"میرے ماں باپ مسلمان ہیں، ایک گھنٹہ پہلے میں بھی مسلمان تھی، میں نے ابھی ابھی مسیحیت قبول کی ہے"

خوشی کی ایک لہر اُس کے چہرہ پر دوڑ گئی، وہ پادری کی مصنوعی بلند پوزیشن سے سر کے بل گرا، اُس کے کردار کا ہلکا پہلو سامنے آگیا، اُس کا وہ ذمہ دارانہ لہجہ مفقود ہو گیا۔

"اوہو۔ تم بڑی عقلمند لڑکی ہو، تم کھوٹا کھرا پہچان سکتی ہو، میں بیوقوف تھا۔ میں نے تم کو دوسری لڑکیوں کی طرح سمجھا۔ یہ عیسائی لڑکیاں!۔ انھوں نے تو گرجا کو بال روم بنا دیا ہے، وہ نہایت خوبصورت لباس پہنکر آتی ہیں سروس کے وقت اپنے ساتھ والے بدمعاش لڑکے کے ہاتھ میں ناخن چبھو دیتی ہیں اور پھر مجھ سے کہتی ہیں۔ بزرگ باپ پچھلے ہفتے ایک بدمعاش لڑکے نے میری عصمت پر حملہ کر دیا، میں آئندہ کے لئے توبہ کرتی ہوں، میں دل سے شرمندہ ہوں اور باہر جاکر جس لڑکے کے ہاتھ میں ناخن چبھویا تھا، اُس کے ساتھ سینما دیکھنے کو چلی جاتی ہیں، مگر تم ایسی نہیں ہو، عیسائی مذہب کو دوسرے مذہبوں پر ترجیح دینے والی لڑکی ایسی نہیں ہوسکتی۔ تم نے میری تقریر سُنی ہوگی، ضرور سنی ہوگی"

"ہاں" ۔۔۔۔۔ پادری سوچنے لگا:۔

"کون کہہ سکتا ہے، میری تقریر میں اثر نہیں؟ لوگ مجھ پر ہنستے ہیں، کہتے ہیں میں نے دس سال کی ملازمت میں کوئی عیسائی نہیں بنایا، دراصل میں لالچی نہیں، ایک عیسائی بنانے والے کو پچاس روپے انعام ملتا ہے، دوسرے پادری جھوٹے سچے طریقوں سے اپنی تنخواہ کو دگنا کرلیتے ہیں، میں حلال کی کمائی کو پسند کرتا ہوں، خیر اچھا ہوا، اس دفعہ مجھے دوسو پچاس روپے ملیں گے، دوسو روپے تنخواہ اور پچاس روپے انعام۔ فرنیچر ہاؤس کا بل چکا دوں گا چھ مہینے سے تنگ کررہا ہے، لڑکی سے مخاطب ہوکر بولا: "تم نے میری تقریر کو بہت پسند کیا ہوگا، کتنی فصاحت کے ساتھ میں نے کہا تھا: "ہم کسی مذہب کے خلاف شکایت نہیں رکھتے، ہم کسی مذہب کے بانی سے عداوت نہیں رکھتے، ہم سب مذہبوں کو سچا سمجھ کر اُن کی قدر کرتے ہیں، ہم تمام مذہبوں کے بانیوں کو بنی آدم کا خیرخواہ سمجھ کر اُن کا احترام کرتے ہیں لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نجات ڈھونڈنے والوں کو نجات صرف مسیح کے مذہب میں مل سکتی ہے، کیونکہ تمام مذہبوں میں یہی ایک مذہب سچا ہے اور مذہبوں کے بانیوں میں مسیح ہی بنی آدم کا خیرخواہ ہے"۔ مجھے یقین ہے، تم نے میری غیرجانبداری کو بہت پسند کیا ہوگا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ میری تقریر میں کونسی ایسی بات تھی جس نے تم کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کردیا۔"

"کچھ بھی نہیں"۔ وہ سمجھ گئی تھی، پادری ایک کمزور کردار کا آدمی ہے۔

"کیا کہتی ہو؟ کچھ بھی نہیں!"

"تم کو تقریر کرنا نہیں آتی"

پادری کو یکایک اپنے مالی پہلو کا احساس ہوا، خوشی مایوسی کی شکل اختیار کرنے لگی،

"کیا تم کو میری تقریر نے عیسائی نہیں بنایا؟"

"نہیں"

"اور مجھ کو پچاس روپے الاؤنس نہیں مل سکے گا؟"

"نہیں"

"پھر میں فرنیچر ہاؤس کا بل کیسے ادا کروں گا"

"میں نہیں جانتی"

"لڑکی! تو بڑی سنگدل ہے۔ میں نے تیری اتنی تعریف کی ہے، کیا تو میرے لئے ذرا سا جھوٹ نہیں بول سکتی، تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ مجھے پچاس روپے مل جائیں گے، مہینہ آرام سے گزر جائے گا، تیرا احسان ہوگا"

"میں جانا چاہتی ہوں"

"نہیں، نہیں، دیکھو، ٹھہرو تم نے اپنے گناہ تو ابھی بخشوائے بھی نہیں، تمھاری شکل بتاتی ہے، تم نے بہت گناہ

کئے ہیں، کیا تم دوزخ میں جلنا پسند کروگی، تمھاری بھولی بھالی شکل بتاتی ہے، تم آگ برداشت نہیں کر سکوگی، تم اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو، نازوں میں پلی معلوم ہو، میں تمھارے لئے ضرور دعا کروں گا، تم کو اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کی بھی ضرورت نہیں گناہوں کا بوجھ اور اُس پر اعتراف کی بے حیائی، یہ تم نہیں کر سکتیں، اس کے بجائے تم مجھے پچاس روپے آسانی سے دے سکتی ہو، لاؤ میں ابھی خدا سے تمھاری سفارش کرتا ہوں۔"

"میں جانا چاہتی ہوں"

اُس کے لہجے میں سختی پیدا ہوگئی، پادری کی باتوں نے اُس کو بے حد مایوس کر دیا تھا، وہ باہر جانے کے لئے پلٹی، پادری نے کہا

"اچھا اگر تم یوں نہیں مانتیں تو مجھے پچاس روپے قرض دیدو، میں پہلی تاریخ کو ادا کر دوں گا۔"

"تم بے وقوف ہو"

اُس نے دروازے کی طرف قدم اُٹھایا، پھٹی ہوئی آنکھوں سے، کھلے ہوئے منھ کے ساتھ پادری اُس کو دیکھ رہا تھا، اُس کا ہر قدم اُس کے دماغ کے اعصاب پر ہتھوڑے کا کام دیتا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا آخری قدم اُس کے دماغ پر آخری ضرب ہوگی، وہ کانپ گیا، وہ آج اس قدر کیوں گر گیا، اُس کی سمجھ سے باہر تھا، جہاں تک اُسے یاد ہے، اُس نے پہلے ایسا کبھی نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ اپنی فطرت کو کامیابی کے ساتھ چھپاتا آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عورت قیامت برپا کر دے گی، اس وقت اسکی مسیحیت خطرے میں تھی، وہ تیزی سے اُٹھا، جنگلے کی دائیں جانب سے دروازے کے سامنے آیا اور اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"بیٹی! تم مجھ سے ناراض ہو؟ کیا تمھارا خیال ہے ایک پادری کسی کو ناراض کر کے آرام کی نیند سو سکتا ہے؟ پادری جس نے اپنی تمام زندگی لوگوں کی خوشنودی کے لئے وقف کر دی ہو، میں مانتا ہوں، میں نے حیرت انگیز باتیں کی ہیں، لیکن بیٹی! میرے سینے میں بھی دل ہے، اور دل کبھی کبھی بھٹک ہی جایا کرتا ہے، آسمانی باپ ہمارے کتنے کتنے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے، کیا تم ان معمولی باتوں کو معاف نہیں کر سکتیں، تم کو دیکھ کر میرے پدرانہ جذبات بیدار ہو گئے تھے، تم کو دیکھ کر مجھے اپنی پیاری بیٹی گلوریا یاد آگئی تھی، اُس کی ماں کے انتقال کے بعد میں اُس سے ایسی ہی بچوں کی سی باتیں کیا کرتا تھا، جب سے اُس کی شادی ہوئی ہے، میں ایک باپ کے لہجے میں باتیں کرنے کے لئے ترس گیا ہوں، منحوس تھا وہ وقت جب میں نے دوسرے پیشوں کے مقابلہ میں اس پیشے کو اختیار کیا تھا، مجھ کو اپنی حقیقی فطرت سے بلند ہو کر ایک مصنوعی فضا میں رہنا پڑتا ہے، معلوم نہیں جہالت کی کسی بُری ساعت میں میں نے اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہن لی تھیں، لیکن اب اُن کو اُتار کر پھینک دینا دشوار ہے۔ میرے جذبات، میرے خیالات، میرے احساسات اور میرے ملبوسات پر دوسروں کا قبضہ ہے، میری گفتگو اور میری زندگی پبلک کی منشا کے مطابق ہونی چاہئے۔ میں غلامی کے خلاف ہوں، لیکن خود دوسروں کا غلام ہوں، میں دوسروں کو پیروں کے نیچے کچلا جانے سے بچاتا ہوں، اور خود دیروں کے نیچے کچلا جا رہا ہوں، میں دوسروں کے لئے امن و سلامتی کی دعائیں کرتا ہوں اور خود بےچینی و بے قراری میں زندگی بسر کر رہا ہوں، بیٹی! تم عقلمند ہو، تم ان باتوں کو خوب سمجھتی ہوگی، آؤ بیٹی! انسان سے نفرت کرنا اچھا

نہیں، میں انسان ہوں، آؤ! مقدس باپ کا دربار سب کے لئے کھلا ہے، وہ تم کو بخش دے گا۔"

"میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے لئے نہیں آئی تھی، بزرگ باپ!"

"اور؟"

"میں اس کمرے کو دیکھنا چاہتی تھی، جس طرح کوئی سیر کرنے والا کسی پرانی عمارت کو دیکھنے کے لئے جاتا ہے۔"

"عجیب باتیں کرتی ہو، آخر کون ہے جس نے کوئی نہ کوئی گناہ نہ کیا ہو؟"

"میں اپنے گناہوں کو بخشوانا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"میں ابھی اور گناہ کرنا چاہتی ہوں۔"

اُس نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے اُس کی طرح دیکھا، اُس نے محسوس کیا کہ وہ اعتراف کے لئے آنے والی معمولی لڑکیوں کی طرح نہیں ہے، اُس کے خیالات بیسویں صدی کے نوجوانوں کی طرح باغیانہ ہیں، لیکن وہ کسی استدلال پر مبنی نہیں، اس لئے زیادہ توجہ کے قابل بھی نہیں، اُس نے اپنے متعلق لڑکی کے دل میں اچھی رائے قائم کرنے کے لئے گفتگو کو طول دے دیا:

"عجیب لڑکی ہو، میں نے ساری عمر میں تم جیسی لڑکی نہیں دیکھی، تمھاری بہکی بہکی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو کسی کے خلاف کچھ شکایات ہیں، کیا تم میرے چند سوالات کا جواب دے سکو گی؟"

وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر جنگلے کے نزدیک آکر کھڑا ہو گیا، لڑکی پلٹ کر وہیں دروازے کے پاس کھڑی رہی:

"آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"میں جاننا چاہتا ہوں، تم نے عیسویت میں کیا جاذبیت دیکھی؟"

"کچھ بھی نہیں"

"یا یوں کہو، تم نے اسلام میں کیا کمزوری محسوس کی؟"

"کچھ بھی نہیں"

"تو کیا تم مسیحیت کو اسلام سے بہتر سمجھتی ہو"

"نہیں، یہ بات نہیں، مذہب اپنی اصلیت میں کوئی بُری چیز نہیں، تمام مذہبوں کے بانی بنی آدم کے لئے فطرتی ہمدردی لے کر آئے تھے، اور اُن کے اداروں نے بہت دیر تک دُنیا کی امکانی خدمت کی ہے، جب انسانی قانون اپنے ابتدائی مرحلے طے کر رہا تھا، روحانی قانون اپنے غیر مرئی پس منظر کے ساتھ دنیا کی بدعنوانیوں پر قابض تھا، انسانی زندگی کے لئے بلند معیار قائم کرنے میں مذہب پیش پیش رہا ہے، مذہب کی بنیاد کو کوئی شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا، ابراہیم، زرتشت، گوتم، عیسٰے اور محمدؐ کے احسانات کائنات کے صفحات پر کبھی نہ مٹنے والے حرفوں سے لکھے ہوئے ہیں، لیکن ہم درخت کا مطالعہ اسوقت کرتے ہیں جب وہ

زمین سے باہر آکر فضا میں بڑھتا ہے، پھولتا ہے، پھلتا ہے، درخت لگانے والے کی نیک نیتی سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، درخت لگایا گیا تھا کہ لوگ اُس کے سائے میں آرام کریں، بدقسمتی سے درخت خاردار ثابت ہوا جو اپنے نیچے سے گزرنے والے لوگوں کی پگڑیاں اُتار لیتا ہے، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ درخت کو اچھے پانی سے نہیں سینچا گیا، اُس کی پرورش عقلمند ہاتھوں نے نہیں کی آج حضرت عیسٰے میرے سامنے ہوتے تو میں اُن کو بتاتی کہ اُن کے عالمگیر مشن کے فیل ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے عورت کو ایک گناہوں کی طرف مائل کرنے والی نفرت انگیز چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ دوسرا سبب یہ کہ مسیحیت میں رہبانیت، اور تجرد کو شامل کرکے انسان کے لئے ایک نہ اُٹھ سکنے والا بوجھ بنا دیا، نئی عورت نے پُرانی مسیحیت سے اپنے حقوق چھین کر حضرت عیسٰے کے ادارے، کو پاش پاش کر دیا ہے۔ عورت کی یہ شاندار کامیابی انسانی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی ایک دفعہ پہلے بھی حضرت محمدؐ کے وقتوں میں مسیحی استبداد کے اس عمل کی تردید ہو چکی ہے، لیکن وہ ریفارمر ہونے کے علاوہ شاید سیاست داں بھی تھے، اُن کی متعدد شادیاں ہندوستان کے بادشاہ اکبر کی سیاسی شادیوں کے ہوتے ہوئے، ممکن ہے، سیاسی مصلحت پر مبنی تسلیم کر لی جائیں، لیکن نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ مسلمانوں کو چار شادیوں کی اجازت دیدینا اور عورتوں کو ہمیشہ کے لئے پردے کی بلا میں مبتلا کر دینا اور قیامت ہو گیا۔"

پادری مرعوب ہو گیا، لیکن وہ لڑکی کی غیر معمولی ذہانت کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ اپنے کردار کو لڑکی کے کردار سے بلند تر رکھنا چاہتا تھا، اُس کا لہجہ اُس کی غمازی کر رہا تھا۔

"لڑکی! تو نے اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ واقعی بالکل درست ہے، میں تم کو تمھاری عقلمندی کی داد دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن مسیحیت کے متعلق تمھارے خیالات سراسر غلط ہیں، تمھیں مسیحیت کا اور مطالعہ کرنا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے جب تم دونوں مذہبوں کو پسند نہیں کرتیں، تو تمھارے مذہب بدلنے کا کیا مطلب ہے؟"

"مذہب بدل لینا کوئی بڑی بات نہیں، میں نے مذہب بدل دیا، جس طرح پیرس کی ایک عورت ایک ہفتے کے بعد اپنے کپڑوں کو پُرانا فیشن کہکر بدل ڈالتی ہے، سب مذہب بدلنے والوں کو کسی ایسے ہی مقصد کو سامنے رکھکر اپنا مذہب بدلنا چاہئے، اخلاقی معیار کی بلندی کے حصول کے لئے مذہب بدلنے والا مذہب بدل کر اپنی شخصیت کی کمزوری کا اعلان کرتا ہے، بلند اخلاق کا انسان اپنے اخلاق کی بلندی کو قبیح سے قبیح حالات میں بھی برقرار رکھنے کی اہلیت رکھتا ہے، جس میں یہ اہلیت نہیں، اُس کا اخلاق دوسرے مذہب کے دامن میں بھی محفوظ نہیں۔ ایک ماحول سے ڈرکر دوسرے ماحول میں پناہ لینا بزدلی ہے۔ حضرت محمدؐ نے مذہب قبول نہیں کیا تھا مذہب پیدا کیا تھا۔ ہم کو مذہب قبول نہیں کرنا چاہئے، مذہب پیدا کرنا چاہئے ہر شخص کو ایک جداگانہ مذہب درکار ہے، آزاد و بے تعلق، آخر مذہب ہماری زندگی میں کیا حصہ لیتا ہے؟ ہم ماں باپ سے مذہب اس طرح لیتے ہیں جیسے کالج کا ہیڈ کلرک کالج کے لڑکوں سے فیس لیتا ہے، اور اُس کو تمام عمر اس طرح اپنے ساتھ رکھتے ہیں جیسے اپنے سائے کو ہمیشہ اپنے ہمراہ لئے پھرتے ہیں، کالج کا ہیڈ کلرک، ہزاروں روپے کے نوٹ وصول کرکے بھی

خود کو روک فیلر کا ہمسر خیال نہیں کرتا اور سایہ تمام عمر ساتھ رہ کر بھی ہم کو کبھی نہیں کہتا کہ میں تمھارا سایہ ہوں - اخلاق کے زخم ہم خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتے ہیں، اخلاق کے پھول بھی ہم خود اپنے ہاتھوں سے لگاتے ہیں، مذہب جراحت نہیں جانتا، مذہب باغبانی بھی نہیں جانتا"

"کیا اس فاضلانہ تقریر سے تم نے مجھے یہ بتایا ہے کہ تم نے آج عیسائی مذہب کیوں قبول کیا ہے ؟"

"نہیں"

اُس کو پادری کی پست ذوقی پر ہنسی آگئی -

پادری بولا: "میں تو سیدھے سادھے الفاظ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے عیسائی بننے کی ضرورت کیوں محسوس کی ؟"

"سچ سچ ؟"

"ہاں"

"بالکل سیدھے سادھے الفاظ میں ؟"

"ہاں"

"سنو ! میں نے مسیحی مذہب اس لئے قبول کیا ہے تاکہ میں گرجا کو بال روم سمجھ سکوں، حسین سے حسین کپڑے پہن کر یہاں آیا کروں، سروس کے وقت اپنے ساتھ والے بدمعاش لڑکے کے ہاتھ میں ناخن چبھو دوں، باہر جا کر اُس کے ساتھ سیر کیلئے جاؤں، اُس کے ساتھ سینما دیکھوں، زندگی کی تمام لذتیں حاصل کروں، دُنیا کے تمام گناہ کر ڈالوں، اور تمھارے سامنے آکر کبھی اپنے گناہوں کا اعتراف نہ کروں"۔

"کیا بکتی ہو ؟"

"سچ کہتی ہوں"

"تم جا سکتی ہو"

لڑکی تن کر کھڑی ہوگئی، اُس کا جوش غصے میں تبدیل ہونے لگا، اُس نے اپنے لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا:-

"تم میری توہین کر کے مجھے باہر نہیں نکال سکتے - میں ایک معزز لڑکی ہوں"

"کیا معزز لڑکی کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟"

"شرم سب سے بڑی بے شرمی ہے - بے شرمی سب سے بڑی شرم ہے، عورت کے دل میں شرم پیدا کر کے آدمی نے عورت کو بغاوت کے ناقابل بنا دیا، اس وقت عورت کو دو دشمنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شرم اور آدمی، عورت بغاوت پر آمادہ نظر آتی ہے، تو آدمی اُس کے جذبات سے اپیل کرتا ہے - عورت بیدار ہوتی ہے، تو آدمی لوریوں سے پھر اُس کی آنکھیں بند کر دیتا ہے، بے شرمی بیداری ہے، شرم آنکھیں بند کرنا ہے"

پادری نے یہ محسوس کرکے کہ کہیں لڑکی کی تیز گفتگو کو سنکر لوگ نہ اکٹھا ہو جائیں، اُس نے معذرت کے لہجہ میں کہا:-

"خفا کیوں ہوتی ہو؟"

"خفا اس لئے ہوتی ہوں کہ جس مقصد کے لئے اتنی دور سے آئی تھی وہ پورا نہیں ہوا"

"کیا مقصد؟"

"آج سروس کے وقت کوئی ناخن چھونے کے لئے نہیں ملا، رات کس طرح گزرے گی"

"بے شرم لڑکی!"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں، بڑے حوصلہ افزا الفاظ ہیں"

"یہ سب تمہارے ماں باپ کا قصور ہے، تمہاری تربیت اچھی نہیں ہوئی"

"میرے ماں باپ کو مجھے تربیت دینے کا کیا حق تھا؟ میری تعلیم اور میری تربیت میرا معاملہ ہے، ماں باپ رہنمائی نہیں کرتے، ماحول رہنمائی کرتا ہے، ماں باپ ابوجہل پیدا کرتے ہیں، ماحول محمدؐ پیدا کرتا ہے۔ وقت حرکت میں ہے، ایک منٹ میں ایک لاکھ میل چلتا ہے، سوسائٹی ساکن ہے، اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرتی، ماں باپ ایک لاکھ میل فی منٹ کے حساب سے دوڑنے والی ٹرین پر سفر کرنے سے ڈرتے ہیں، اور چپ چاپ بے حرکت ایک دقیانوسی چھکڑے میں جس کے پہئے ناہموار پتھریلی زمین نے چکنا چور کر دئے ہیں، بیٹھے رہتے ہیں، ناگہاں کوئی اُن کی حالت پر رحم کھانے والا پیدا ہو جاتا ہے، اور اُن کو اور اُن کے دقیانوسی چھکڑے کو ایک لاکھ میل فی منٹ دوڑنے والی ٹرین کے نیچے پھینک دیتا ہے"

"گستاخ لڑکی! تو ماں باپ کے احسان سے بھی انکار کرتی ہے"

"مجھ پر میرے ماں باپ کے احسانات اس قدر ہیں کہ میرے لئے اُن کا شمار ناممکن ہے، بہرکیف میں کوشش کرونگی میرے ماں باپ کسی قدر بدقسمت واقع ہوئے ہیں، سیب کے درخت کا بیج بوتے تھے، مولیاں اُگ آتی تھیں، ایک نہیں، دو نہیں، اکٹھی چھ لڑکیاں اُن کے ہاں پیدا ہوئیں اور صرف ایک لڑکا، میرے والد پی، ڈبلیو، ڈی میں جمعدار تھے، تنخواہ قلیل تھی رشوت ناممکن تھی، میری بڑی دو بہنوں نے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی کیونکہ چوتھی جماعت تک تعلیم مفت ہوتی ہے، میں آٹھویں جماعت تک پہونچ گئی، کیونکہ میں نے چوتھی جماعت میں وظیفہ حاصل کر لیا تھا، میرا بھائی ساتویں جماعت میں سات دفعہ فیل ہوا، اس لئے اسکول سے اُٹھا لیا گیا، بھائی کے مقابلے میں ہمارے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوتا تھا۔ اُس وقت ہمیں کبھی بغاوت کا خیال نہیں آیا، کیونکہ ہمیں بھی اپنے لڑکی ہونے کو نفرت سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ دو بڑی بہنوں کو اور مجھ کو چھوڑ کر، میرے ماں باپ کو پہلے ہمارے بھائی کی شادی کرنے کا خیال آیا، سودا اس طرح قرار پایا کہ جو لڑکی ہمارے بھائی سے منسوب ہوگی، اُس کے دو بھائیوں کو میری دونوں بہنیں بیاہی جائیں گی اس طرح خرچ کم ہوا، اور صرف سات سو روپیہ قرض لینا پڑا، جو بعد کو سود سے بارہ سو روپے ہو گیا اور ہمیں مکان بیچ کر حساب بیباق کرنا پڑا، میری ایک بہن کا خاوند درزی تھا، غالباً اُس کا کام کم چلتا تھا، اپنے ماں باپ

ے اور میری بہن سے لڑتا رہتا تھا، ایک دن موقعہ پاکر روپوش ہوگیا۔ اب تک اُس کا پتہ نہیں کہاں ہے، میری بہن واپس آگئی، دوسری بہن کا خاوند ریلوے اسٹیشن پر کال مین تھا، ایک دفعہ ایک گارڈ کو جگانے گیا جگانے سے پہلے اُس کے لٹکتے ہوئے کوٹ میں سے تین روپے ساڑھے سات آنے نکال لئے، خانساماں نے پکڑ لیا، یہ اُس کا چھٹا جرم تھا، اس لئے اُس کو لمبی قید ہوگئی۔ میری بہن ہمارے ہاں واپس آگئی، شادی کے چھ ماہ بعد بھائی یکایک پاگل ہوکر غائب ہوگیا، ابا نے اُن کی بیوی کو واپس نہیں بھیجا کہ جانے لڑکا کب واپس آجائے، اب ہم ایک ہی پنجرے میں ایک ہی جنس کے سات جانور تھے۔ اس لئے گزارا مشکل ہوگیا، تھوڑے عرصے کے بعد دوسری لڑکیوں کی شادیوں کا سوال پیدا ہوا، دوکان میں مال زیادہ تھا، گاہک کم تھے، اس لئے والدین نے کوڑیوں کے دام مال نکال ڈالنے کا تہیہ کرلیا۔ میری منگنی پولیس کے کانسٹبل سے ہوئی، میں اُس وقت دسویں جماعت کی پرائیویٹ تیاری کررہی تھی، ایک ایف، اے کلاس کا عیسائی لڑکا پڑھائی میں میری مدد کیا کرتا تھا، میں اُس کے ساتھ بھاگ گئی، ایک ہفتہ گزر گیا، اُس کو ملازمت نہ ملی، آٹھویں دن اُس نے اپنے بوٹ بیچ کر ہوٹل کے اخراجات ادا کئے، ہم دونوں کے پاؤں برابر تھے۔ وہ میری سلیپر پہن کر ملازمت ڈھونڈنے کے لئے چلا گیا، پھر واپس نہیں آیا، ہوٹل میں ایک جنٹلمین کھانا کھانے کے لئے آیا کرتے تھے۔ میں نے اُن کو اپنی طرف مایل کرلیا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے، چار دن بڑے آرام سے گزرے، پانچویں دن رات کو دو بجے کے قریب اُن کی بیوی اور تین بچے اُن کے سالے کے ساتھ بغیر اطلاع آگئے۔ اُن کی بیوی نے اُن کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اُن کے سالے نے مجھے بہت مارا۔ وہ مجھ کو اپنے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آئے، وہ انکم ٹیکس آفس میں کلرک تھے، مجھ کو اُن سے بہت نفرت ہے، پارسا بنے پھرتے تھے، مجھے ہمیشہ بہن کہتے تھے جتنے دن وہاں رہی نن بن کر رہی۔ اُن کے ہاں سنیما کے ایک منیجر آیا کرتے تھے، میری اُن سے آنکھ لڑ گئی۔ ایک دن موقعہ پاکر اُن کے مکان پر پہونچ گئی۔ جتنی دیر اُن کے پاس رہی سینما اور سیر میں زندگی بسر ہوئی، ایک دن آکر کہنے لگے، میری منگنی ہوگئی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا، کہنے لگے: گھبراؤ نہیں، میں تم سے محبت کرتا ہوں، قیامت تک تمہارا رہوں گا، ایک غرض سے شادی کررہا ہوں، لڑکی کے ماں باپ بہت امیر ہیں، میں نے اُن کو شادی کے بعد فلم کمپنی جاری کرنے پر آمادہ کرلیا ہے، تم میری چیف ایکٹرس ہوگی، تمہارے ساتھ رہنے پر اعتراض کرتے ہیں، میں تم سے جدا ہونے پر مجبور ہوں، اس ٹرین سے چلی جاؤ، وہاں ایک کمپنی کے منیجر میرے دوست ہیں، وہ تمہیں اپنی کمپنی میں لے لیں گے، میں نے اُن کو خط لکھ دیا ہے۔ یہاں آگئی، یہاں اتفاقاً ایک عیسائی لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ سیاہ رنگ کے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ملبوس تھی۔ میں نے پوچھا:- کہاں جارہی ہو؟ اُس نے کہا، گڈ فرائڈے ہے، گرجا جارہی ہوں۔ میں نے کہا:- کیا تم ہمیشہ گرجا جاتی ہو؟- اُس نے کہا:- نہیں، میں اتنی پُرانے فیشن کی نہیں، ایک دوست سے وعدہ ہے۔ فوراً مجھے خیال آیا کہ ایکٹرس کی زندگی سے عیسائی لڑکی کی زندگی بہتر ہے، ایکٹرس اپنے دل کی زندگی بسر کرتی ہے، لیکن بدنام ہے، کرسچین لڑکی اپنے دل کی زندگی بسر کرتی ہے اور معزز ہے، ایکٹرس آزاد ہے، لیکن اُس کی آزادی مظلوم عورت کو آدمی کے پنجے سے نہیں چھڑا سکتی۔ کرسچین لڑکی آزاد ہے اور اُس کی آزادی آدمی سے عورت کی صدیوں کی بے انصافیوں کا انتقام لے سکتی ہے، میں نے اُس سے کہا:- میں عیسائی ہونا چاہتی ہوں، وہ خوش ہوگئی۔ شاید اُس کو بھی تمہاری طرح

الاؤنس کا خیال تھا، میں یہاں آگئی، اور اب تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔"

"لڑکی! میری آنکھوں سے اوجھل ہو جا!"

"میں جا رہی ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے، میں اب تک ایک اندھے کو چراغ دکھاتی رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"تم اندھے ہو، اور میں چراغ ہوں"

"میں نہیں سمجھا"

"میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں، کہ کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟"

"ایک پادری کو عورت کا حُسن گھائل نہیں کر سکتا"

"یہ میرے حُسن کی توہین ہے، حُسن کا جادو گھائل کرنے ہی کے لئے ہوتا ہے، تم فطرت کے قانون کو نہیں توڑ سکتے"

"لیکن بیوقوف لڑکی! میری عمر ۴۵ سال کی ہے"

"میں ۲۰ سال کی ہوں، صرف ۲۵ سال کا فرق ہے، کوئی بڑی بات نہیں، اس کے معنے صرف یہ ہوئے کہ تم مجھ سے ۲۵ سال پہلے مرجاؤ گے، اور میں ۲۵ سال زندہ رہوں گی، میں خوش ہوں۔"

"لڑکی! اس معاملہ میں بہت سمجھنے سوچنے کی ضرورت ہے۔"

"محبت میں سمجھنا سوچنا حرام ہے!"

"محبت!"

"میں تم سے محبت کرنا چاہتی ہوں"

پادری کے انکار کی دیوار پہلے ہی کمزور تھی، اس فقرے نے اُس کو بالکل گرادیا، وہ ایک دفعہ پھر اپنی پوزیشن کو بھول گیا، اُسکو اپنی خشک زندگی میں رنگینیوں کی ایک جھلک آتی ہوئی معلوم ہوئی، اُس نے اپنے شکست خوردہ کھسیانے پن کو چھپانے کی بیجد کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

"گلوریا کی ماں کے انتقال کے بعد بہت لوگوں نے مجھے اِس قسم کی ترغیبیں دی تھیں، لیکن ــــ"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، میں کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہیں۔"

"لیکن اِس عمر میں شادی کرتے ہوئے کچھ ڈر معلوم ہوتا ہے"

"شادی! شادی کرنے کے لئے تم سے کس نے کہا، میں کہتی ہوں، میں تم سے محبت کرنا چاہتی ہوں، کہاں محبت اور کہاں شادی، دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، گویا تم مجھے قید کرنا چاہتے ہو، نہیں نہیں، یہ نہیں ہوگا۔ ممکن ہے کل کو مجھے تم سے کوئی بہتر آدمی مل جائے، شادی ہوگئی تو تم مجھے اُس کے ساتھ کب جانے دو گے؟"

دروازہ کھلا، ایک لڑکا سیاہ سوٹ میں داخل ہوا، لڑکی کے جواب نے پادری کے جذبات کو مجروح کر دیا تھا، اُس کی گویائی کی طاقت فنا ہو چکی تھی۔ دروازے کا کھلنا اُس کے زخم پر مرہم ثابت ہوا، اُس نے اطمینان کا ایک سانس لیا، لڑکے نے اندر آتے ہی کہا

"پاپا! آپ کیا کر رہے ہیں، ایک گھنٹہ ہو گیا، لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، انھوں نے مجھے بھیجا ہے، کہتے تھے، جاؤ، دیکھو، ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ تمھارا باپ کیا کر رہا ہے۔"

"ولیم! یہ ایک پاگل لڑکی ہے۔" پادری نے اپنے حواس سنبھالتے ہوئے کہا۔

لڑکی نے مڑ کر لڑکے کی طرف دیکھا اور اُس پر بھیڑئے کی طرح جھپٹی، اُس کو کوٹ کے کالروں سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا اور دائیں دیوار کے ساتھ پوری طاقت سے پٹخ دیا، پھر اُس کی طرف بھاگی اور اُس کو کونے میں جا کر دبوچ لیا، گھٹنوں کے نیچے پھینک کر دونوں ہاتھوں سے اُس کے گلے کو دبانا شروع کر دیا، پادری اُن کی طرف بھاگا، لڑکے نے اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے اُس کے دائیں رخسار پر ایک خوفناک طمانچہ مارا، پادری نے پیچھے کی طرف اُلٹتے ہوئے "بچاؤ، بچاؤ!" کا شور مچا دیا۔ لوگ اندر آ گئے، انھوں نے اُن کو علٰحدہ علٰحدہ کر دیا، لڑکی تیز تیز سانس لیتے ہوئے کہنے لگی:

"مار ڈالوں گی، اِس مردود نے مجھے بہت پریشان کیا ہے، مجھے گھر سے بھگا کر لے آیا، ہوٹل میں مجھے چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ میرے سلیپر بھی پہن گیا، اور آج جبکہ میں اور اس کا باپ آپس میں محبت کر رہے تھے، رقابت سے جل کر ہماری محبت میں رخنہ ڈالنے کے لئے اندر آ گیا، میں نے اس کے باپ کی شادی کی درخواست کو رد کر دیا ہے، لیکن محبت کی راہ میں یہ حائل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ہمارے معاملے میں دخل دے گا، تو میں اس کو چھوڑوں گی نہیں، مار ڈالوں گی"

وہ پھر اُس کی طرف جھپٹی، لیکن لوگوں نے اُس کو روک لیا، ولیم بھاگ کر ایک کونے میں چھپ گیا، اس کے بعد لوگوں نے حیران ہو کر پادری کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اُس نے کہا:

"غالباً میرے عقلمند دوستوں کو مجھ سے اتفاق ہوگا کہ لڑکی پاگل ہے"

ولیم کو کچھ حوصلہ ہوا، اُس نے پیچھے سے آگے آ کر ایک آدمی کی آڑ لیتے ہوئے اُس کے کندھے کے اوپر سے کہا:-

"پاگل لڑکی! کیا میں اتنا پاگل تھا، کہ ایک پاگل لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے تیار ہو جاتا، ہوٹل کے سات دن کے قیام میں تم نے مجھے گیارہ دفعہ مارا، آٹھویں دن مجھے تم سے ایک بہتر لڑکی مل گئی، وہ تم سے زیادہ خوبصورت تو نہیں لیکن تم سے زیادہ دولتمند ہے، مجھے ملازمت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہاں سے بھاگ کر ہم یہاں آ گئے، اب وہ ایک فیکٹری میں سٹینو ٹائپسٹ ہے، وہ کماتی ہے، میں کھاتا ہوں"

"ساری عمر میں تو نے آج ایک عقلمندی کی بات کی ہے، کیا میں اُس لڑکی کو دیکھ سکتی ہوں جو تمھارے دل سے مجھ کو نکال کر خود تمھارے دل کی مالک بن بیٹھی، میں اُس لڑکی کی تعریف کرتی ہوں"

ولیم نے خوش ہو کر "جینی! جینی!" پکارنا شروع کیا، جینی لوگوں کو چیرتی ہوئی آگے آ گئی، وہ سیاہ کپڑوں میں ملبوس

ایک نوجوان لڑکی تھی، لڑکی نے جبین کو دیکھ کر مسرت کے لہجے میں کہا:

"بزرگ باپ! یہی وہ لڑکی ہے، جو آج مجھے ملی تھی اور جس نے کہا تھا: میں اتنے پرانے فیشن کی نہیں کہ چرچ میں عبادت کے لئے جاؤں، میں وہاں اپنے دوست سے ملنے جاتی ہوں، میں اس لڑکی کو پسند کرتی ہوں، اس نے مجھے عیسائی کیا ہے، اس کو الاؤنس ملنا چاہئے"۔

"پاگل لڑکی!" پادری نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سامنے کے دائیں دروازے سے باہر نکل گیا

"پاگل" "پاگل" "پاگل" "پاگل"

لوگ لڑکی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے، کمرہ خالی ہوگیا، ہر طرف سکوت چھا گیا وہ کمرے کے درمیان اکیلی کھڑی رہی۔ ایک لمحہ سکتے کا عالم رہا، پھر وہ آہستہ آہستہ جنگلے کی طرف بڑھی، بائیں جانب سے ہو کر سامنے کی دیوار پر عیسےٰ کی تصویر کے آگے کھڑی ہوگئی، آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اُٹھایا اور عیسےٰ کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور بولی:۔

"تمھاری ماں کنواری تھی، میں بھی کنواری ہوں، تمھاری ماں نے تم کو پیدا کیا، کیا میں بھی کسی کو پیدا کر دوں گی؟"

وہ زہ کے درد سے نڈھال ہو کر نیچے گر پڑی۔

انور

"نگار" کے پچھلے پرچے

"نگار" کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کرلیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:

سنہ ۲۶ء: جنوری ۸ر — سنہ ۲۷ء: اگست ۶ر — سنہ ۲۸ء: مئی ۶ر - جون ۶ر — سنہ ۳۰ء: مئی ۱۲ر — سنہ ۳۱ء: جولائی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — سنہ ۳۲ء: جنوری ۱۲ر - فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، ستمبر، نومبر ۸ر فی پرچہ - دسمبر ۶ر — سنہ ۳۳ء: فروری ۸ر — سنہ ۳۴ء: فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۶ر فی پرچہ — سنہ ۳۶ء: دسمبر ۱۲ر فی پرچہ — سنہ ۳۷ء: فروری، مارچ ۱۲ر فی پرچہ - اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ر فی پرچہ - ستمبر، اکتوبر، دسمبر ۱۲ر فی پرچہ — سنہ ۳۸ء: فروری، اپریل تا دسمبر ۴ر فی پرچہ — سنہ ۳۹ء: فروری تا جولائی ۴ر فی پرچہ اگست و ستمبر ۱۲ر فی پرچہ، اکتوبر و نومبر ۸ر فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

گاندھی جی اور فلسفۂ عدم تشدد

اگرچہ سیاسیات عالم میں مہاتما گاندھی کا فلسفۂ عدم تشدد ایک استعمال شدہ کارتوس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تاہم وہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ضرور ہیں اور عوام کے نزدیک اُن کی اس عالمگیر مقبولیت کا راز اُن کے فلسفۂ عدم تشدد میں پنہاں ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ممالک غیر میں اُن کا یہ اقتدار صرف اس لئے ہے کہ پیشوایان جمہوریت ہر اُس چیز کو غیر معمولی اہمیت دے دیتے ہیں۔ جو اُن کے خیال کے مطابق جمہوریت کی بنیادی خامیوں اور تمدّنی بے اعتدالیوں کی پردہ داری کر سکے اور ہندوستان میں اُن کی پرستش کا باعث عوام کی ذہنی بے مائگی ہے کہ آج نہ جانے کتنے لوگ مذہب و روحانیت کی آڑ سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ دُنیا کو آج تک جتنا فریب دیا گیا ہے اس کی سب سے زیادہ ذمہ داری مذہبی اداروں پر عاید ہوتی ہے یا روحانیت کے علمبرداروں پر۔

میں گاندھی جی کی نیت پر تو شک نہیں کرتا کہ انھوں نے بھی شہرت حاصل کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ مگر ہاں یقینی ہے کہ وہ بھی "ایشوری کرپا" کے فریب خوردہ ہیں، یوں تو وہ یہی فرماتے ہیں کہ " دیش کے آگے اہنسا کا سیدھا راستہ دکھانا مجھے ایشوری کرپا سے حاصل ہوا ہے"، لیکن اس اہنسا کا صحیح مفہوم متعین کرنے سے ان کا دماغ ابھی تک قاصر ہے۔

جب کبھی مجھے گاندھی بھگتوں سے فلسفۂ عدم تشدد پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا میں نے دیکھا کہ وہ واقعات سے ہٹ کر روحانیت کی طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسی ایسی باتوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں جن کا تعلق عقل سے بہت کم ہے۔ ایک بھی کانگرسی ایسا نہ ملا جو ملکی حالات پر تبصرہ کرتے وقت عقلی دلائل سے اجتناب نہ کرتا۔

اگر کلیتہً عدم تشدد پر عمل کیا جائے تو انسان محض مٹی کا بُت بن کر رہ جائے اور انسانی ارتقا جو کروڑوں سال کی عملی جد وجہد اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یکدم (نیست و نابود) ہو جائے۔ فلسفۂ عدم تشدد کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کی قوت مدافعت فنا ہو جاتی ہے اور وہ ہمیشہ پردۂ غیب سے کسی معجزہ کے ظہور پذیر ہونے کا منتظر رہتا ہے۔ الغرض مروجہ سیاسی و معاشی مظالم کو دیکھتے ہوئے حصول مقصد کے لئے عدم تشدد از بس غیر مؤثر اور فرسودہ ہے۔

جس وقت گاندھی جی کا سیاسی شعور بیدار ہوا۔ تو آپ کے اعصاب روبہ انحطاط تھے۔ آپ کی لیڈری اسی وقت قایم رہ سکتی تھی جب عدم تشدد کی قسم کا کوئی طریقہ ایجاد کرتے۔ سیاسی حیثیت سے گاندھی جی کی ڈانوا ڈول طبیعت راعی و رعایا دونوں

کے لئے بعید از فہم ہے۔ راجکوٹ کی بھوک ہڑتال اور اس کے بعد اظہار افسوس اس کا کھُلا ہوا ثبوت ہے۔

اس مقالہ سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے وہ یہ کہ شاید مقالہ نگار کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی تشدد کے ذریعہ سے حاصل کی جائے، لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا، میں نے تو عدم تشدد کے صرف نفسیاتی محرکات کا مختصر سا جایزہ لیا ہو اور اس کے سیاسی پہلو سے مجھے کوئی بحث نہیں۔

رام

(نگار) یہ مقالہ ایک ہندو کا ہے اور اس کی اشاعت کا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ گاندھی جی کے متعلق خود ان کی قوم کے بعض افراد کیا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے مقالہ نگار سے کئی باتوں میں اختلاف ہے۔ ایک یہ کہ وہ مذہب کے ساتھ روحانیت کے بھی مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک مذہب و روحانیت دونوں ایک چیز ہیں۔ یعنی مذہب کی حقیقی غایت یہی ہونا چاہئے کہ انسان میں روحانیت پیدا ہو، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیا جائے کہ مذہب نام ہے صرف چند مخصوص معتقدات کا، خواہ انسان میں روحانیت پیدا ہو یا نہ ہو، تو روحانیت کا ذکر یقیناً مذہب سے علحدہ ہونا چاہئے یعنی مذہب کوئی حقیقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن "روحانیت" کی ضرورت کو یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا۔

اس جگہ مجھے مختصراً "روحانیت" کے مفہوم کو واضح کر دینا چاہئے۔ "روحانیت" سے میری مراد تصوف یا فلسفۂ تصوف نہیں جس کے ادارے اسوقت بکثرت ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور جن کی عنان سیادت جوگیوں، سادھوؤں اور پیروں کے ہاتھ میں ہے بلکہ "روحانیت" میری رائے میں "بلندیٔ اخلاق" کا دوسرا نام ہے اور اخلاق کی بلندی کا مقصود صرف یہ ہونا چاہئے کہ تمام "افرادِ نوعِ انسانی" کو خواہ وہ کسی ملک و ملت اور کسی رنگ و نسل سے متعلق ہو ایک ہی شیرازۂ انسانیت سے وابستہ سمجھا جائے، روحانیت کی دُنیا میں نہ کوئی "کافر" ہے اور نہ کوئی "ملکش" بلکہ ہر شخص انسان ہے خواہ وہ خدا کا ماننے والا ہو یا اس کا منکر

پروانہ چراغ حرم و دیر نہ داند

اس معیار کو سامنے رکھ کر جسوقت ہم گاندھی جی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانیت سے خالی نہیں ہیں لیکن اسکی تکمیل اسوقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک ان کی زندگی "مذہبیات" سے بلند نہ ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو بُت پرست ہندو کہتے ہیں اور یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک بُت پرست انسان روحانیت کی برکات سے ایک حد تک متمتع ہو سکے، لیکن روحانیت کے ارتقائی مدارج اسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتے، جب تک ہم ہندو مسلم، خُدا و بُت، صمد و صنم کے امتیاز سے بے نیاز ہو کر اپنا مذہب صرف "انسانیت پرستی" نہ قرار دیں۔ گاندھی جی زبان سے تو یہی کہتے ہیں، لیکن شاید ان کا حال ان کے قال کا ہم آہنگ نہیں اور اس لحاظ سے میرے نزدیک وہ قدرِ اول کے انسان نہیں کہے جا سکتے۔

دوسری بات مجھے اس سلسلہ میں فلسفۂ عدم تشدد کے متعلق کہنا ہے۔ یہ فلسفہ گاندھی جی کی ایجاد نہیں ہے بلکہ اس سے قبل بھی،

لوگوں کے دماغ میں آچکا ہے اور اجتماعی حیثیت سے نہیں تو انفرادی حیثیت سے بار ہا اس پر عمل ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ "ہتیا دینا" ہندوستان کا مشہور محاورہ ہے، جس کا تعلق یہاں کی قدیم مذہبی معاشرت سے بہت دیرینہ ہے۔ ایک کمزور کا اپنی جان دیکر قوی و ظالم کو عذاب اُخروی کے خوف میں مبتلا کرنا یہ ہے اصل مذہبی تخیل اس فلسفہ کا، یا علمی زبان میں یوں سمجھئے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر کے فریق ثانی کو ملامتِ ضمیر کے عذاب میں مبتلا کرنا اس کا حقیقی مقصود ہے۔ ہر چند اس میں کامیابی اسی وقت ہو سکتی ہے، جب دوسرا بھی اسی مذہبی تخیل کا قایل ہو یا وہ ایسا متاثر ہونے والا ضمیر رکھتا ہو، کیونکہ آجتک اس کا ثبوت نہیں ملا کہ نیرو، کالیگولا، اور نادر شاہ نے کبھی اس بات پر تاسف کیا ہو کہ انھوں نے کیوں اتنے بے گناہ انسانوں کا خون بہایا، تاہم اگر اس فلسفہ پر سختی کے ساتھ عرصہ تک عمل کیا جائے تو ایک وقت کامیابی کا آسکتا ہے، لیکن شاید اتنی تباہیوں کے بعد کہ ان کی تلافی اس دُنیا میں ممکن نہ ہو۔ ایک جلاد کی تلوار سے گردنیں کٹواتے رہنا یہانتک کہ خود اس کا ہاتھ شل ہو جائے کوئی معمولی تجربہ نہیں ہے۔ چنانچہ جس وقت گاندھی جی نے نازی حکومت کے خلاف "حکومت برطانیہ" کو اس فلسفہ پر عمل کرنے کا مشورہ دیا تو بلا استثنا سبھی نے اس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم کو فلسفۂ "تشدد" پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔

اپنے حقوق طلب کرنا اور ان کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہر قوم کا فرض ہے، یہاں تک کہ اگر وہ یوں آسانی سے حاصل نہ ہو سکیں تو جنگ و جدال سے بھی احتراز نہ کرنا چاہئے، لیکن ہر تدبیر کا ایک وقت ہوا کرتا ہے۔ آپ نے تو اس مسئلہ کے سیاسی پہلو پر بحث کرنے سے قصداً گریز کیا ہے اور شاید اس ڈر سے کہ مبادا "قانون تحفظ ہند" کی زد میں آجائیں، لیکن میں اس پر بحث کروں گا، کیونکہ صاف دلی کے ساتھ کھُل کر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے —— اگر آپ کے نزدیک "عدم تشدد" بیکار چیز ہے تو اس کا لازمی منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آپ "تشدد" کے قایل ہیں، یعنی اگر ہندوستان کی آزادی کا سوال سامنے ہے تو ہمیں لڑ بھڑ کر اسے حاصل کرنا چاہئے۔ اصولاً بالکل صحیح ہے، لیکن عملی حیثیت سے اس پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ نتیجہ کے لحاظ سے تشدد و عدم تشدد دونوں ایک ہی چیز ثابت ہوں گے، یعنی جانیں دونوں طرح آپ کو خطرہ میں ڈالنا پڑیں گی اور نتیجہ کچھ نہ نکلے گا —— تشدد نام ہے حرب و قتال کا، جنگ و جدال کا اور یہ ذریعہ صرف اسی وقت اختیار کیا جا سکتا ہے جب ہم دشمن کے طریق جنگ کا جواب دینے کے لئے ہر بات میں اس کے برابر ہوں، ورنہ تشدد کو ہم خودکشی کہیں گے یا دوسرے الفاظ میں "ہتیا دینا"، جو عدم تشدد ہی کا دوسرا نام ہے —— اسوقت "تشدد" کے حامیوں کی نیت کا سوال نہیں ہے بلکہ حالات کے لحاظ سے "تشدد" کے محل یا بے محل ہونے پر حکم لگانے کا سوال ہے۔ یوں تو زبان سے تشدد کہدینا آسان ہے، لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا، اس سے ہمارے ملک کے بہت سے نوجوان بیخبر ہیں۔

ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں اسکے توسن کو

میری رائے میں ہندوستان کی آزادی کا وقت ابھی نہیں آیا اور نہ شاید کبھی آئے کیونکہ جب تک یہ ملک مسجد و مندر، اذان و ناقوس کی لعنت سے آزاد نہ ہو جائے، اس کو آزادی کے نام لینے کا حق حاصل ہی نہیں۔ اور اگر برطانوی حکومت نے اکثریت کی قوت سے متاثر ہو کر ہندوستان کو آزاد کر دینے کا فیصلہ کر لیا (جس کی کوئی امید نہیں) تو یہ ایک خاص قوم کی آزادی ہوگی، ملک کی آزادی نہ ہوگی —— ہندو و مسلمان دونوں ایک دوسرے سے جس قدر بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں اس کا اقتضا آزادی نہیں بلکہ غلامی ہے اور اس صورت میں تشدد یا عدم تشدد کی مدد سے آزادی کا مطالبہ کرنا دونوں ایک حکم رکھتا ہے۔ جب تک آزادی نہ ملے اس کے لئے خون بہانا تو خیر کوئی معنی بھی رکھتا ہے، لیکن آزادی ملنے کے بعد جب کشت و خون کا بازار گرم ہوگا تو اُسے آپ کیا کہیں گے؟

مکتوبات نیاز

حضرت محترم ۔ کتاب پہونچی۔ سرسری نگاہ سے دیکھنا اس کی توہین ہے، اور تفصیلی مطالعہ و استفادہ کی فرصت شاید ابھی چند دن اور میسر نہ آئے۔ لیکن آپ کو جاننے والا سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصنیف کتنی پاکیزہ ہوگی۔

آپ نے جس موضوع کو لیا ہے وہ نیا نہیں، لیکن جو پہلو بحث کا آپ نے اختیار کیا ہے وہ بالکل نئی چیز ہے۔ اسی کو ماہرانہ بصیرت اور عالمانہ درک کہتے ہیں۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں صرف اسی مذہب کا قائل ہوں جو تمام غیر فطری اور غیر ضروری آئین و آئی سے بلند ہو کر محض "انسانیت" کی پرستش کا درس دنیا کو دے، اور اگر یہ مقصد "لامذہبیت" سے حاصل ہو سکتا ہے تو میرے نزدیک یہی بہترین مذہب ہے۔

تصوف ہمیشہ میری پریشاں خیالی کی جائے پناہ رہا ہے، لیکن اُس کا علمی یا فلسفیانہ پہلو نہیں جس میں "لطائف قلب" یا "حقیقت و معرفت" وغیرہ کی اصطلاحوں سے بحث کی جاتی ہے، بلکہ اس کا اخلاقی پہلو، اس کا والہانہ مشرب، اس کا نعرہ "ہمہ اوست"، اس کا آوازہ "پندارم تو ئی" کہ اگر آپ عملی زندگی میں اس کی تفسیر کریں تو نتیجہ وہی "انسانیت پرستی" نکلتا ہے۔

محبت کا بندہ ہوں، محبت ہی کی آواز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے اور میری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آسکتی کہ خدا آپ کا ہو سکتا ہے، میرا نہیں۔ حرم بھی اسی کا، دیر بھی اسی کا، اذان میں بھی اسی کی پکار ہے، ناقوس میں بھی اسی کی چہکار ہے، "ضلالت و گمرہی" "نیکی و نجات" ہماری وضع کی ہوئی اصطلاحیں ہیں، وہ ان سب سے بلند ہے، مذاہب نے حقیقی خدا کی حقیقت کو کبھی نہیں سمجھا، بلکہ خود ہی ایک خدا وضع کیا اور اس کے حدود دُنیا کے سامنے پیش کئے۔ یہ سب خدا کا "انسانی تصور" ہے، خدا نہیں۔۔۔ میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اصطلاحی مذہب سے کیوں نفرت پیدا ہوئی۔

ایک دن مجھے نہایت ضعیف عورت نظر آئی جو دھوپ میں بیٹھی ہوئی پتھر توڑ رہی تھی، میں نے اُسے بلا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ بہت کمسنی میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ شادی کے بعد اس کے شوہر نے چھوڑ دیا، اس کے دو بیٹے تھے، جن کو مزدوری کر کر کے اُس نے پالا، بڑا کیا، لیکن وہ بھی جوان ہو کر طاعون میں مر گئے اب پورے بیس سال سے اس کی زندگی یہ ہے کہ پتھر توڑ توڑ کر آنے دو آنے پیدا کرتی ہے اور جہاں جگہ ملی رات کو پڑ رہتی ہے۔

اس کے ہاتھ اس قدر کمزور تھے کہ ہتھوڑا بھی نہ سنبھال سکتی تھی اور بینائی اتنی ضعیف ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی بجائے پتھر کے

وہ اپنے ہاتھ کو زخمی کر لیتی تھی، بدن پر اس کے کپڑے تو خیر کیا، کپڑے کے کچھ تار تھے، جن کے اندر سے اس کے جسم کی جھریاں نظر آتی تھیں میں نے اس کی قومیت پوچھی تو معلوم ہوا کہ "تیلن" ہے۔

یہ سنتے ہی میرے سامنے مسلمانوں کا یہ عقیدہ سامنے آیا کہ "جو مسلمان نہیں اُسے اُخروی نجات نہیں مل سکتی"۔ اور اسی کے ساتھ یہ خیال کہ کیا خدا واقعی اس عورت کو جہنم میں ڈال دے گا! میں ایسے خدا کے خیال سے کانپ اُٹھا، اسلام کے اس ظالمانہ فیصلہ کی طرف سے میرے دل میں کراہت سی پیدا ہوئی اور میں نے سوچا کہ اسلام کی حقیقت کچھ اور ہونی چاہئے، ایک فطری مذہب، خدا کا ایسا بُرا تصور کبھی پیش نہیں کر سکتا کہ ایک بڑھیا، جس کی ساری عمر انتہائی تکلیف میں گزری ہو، جس کے ماحول نے اسے ایک جانور کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور رکھا ہو، جس کی بیدست وپائی نے کبھی اس بات کا موقعہ نہ دیا ہو کہ وہ دُنیا میں کسی کو ستا سکے، بلکہ ہمیشہ وہی ستائی گئی ہو، وہ محض اس تصور پر جہنم میں ڈالدی جائے کہ اس نے اُصول اسلام کے مطابق خدا کو نہیں مانا تھا۔ اس کی ساری زندگی اس بات سے بالکل خالی الذہن ہو کر بسر ہوئی کہ خدا کیا اور مذہب کیسا۔ اس کو اپنی مصیبتوں سے کبھی نجات ہی نہیں ملی کہ وہ مصیبتوں سے نجات دلانے والے "خدا" کا شکریہ ادا کر سکتی۔ لیکن اسلام کا فتویٰ یہ ہے کہ اسے ضرور جہنم میں ڈالا جائے گا کیونکہ وہ ایک بُت پرست ہندو خاندان میں پیدا ہوئی اور اسلام کی روشنی سے فایدہ نہیں اُٹھایا۔

اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ کیا ہندو خاندان میں پیدا کرنے والا اور اس کے ماحول کو اسلام کی روشنی سے دور رکھنے والا کوئی اور خدا تھا؟ کیا ایسی قوت جو ساری عمر ایک ایک دانہ کو محتاج رکھے اور مرنے کے بعد بھی آگ میں جھونک دے، واقعی خدا کہلانے کے قابل ہے؟ کیا خدا انسانوں کا سا احساس رکھتا ہے، کیا واقعی اسے تکلیف ہوتی ہے اگر کوئی اسے نہ مانے، کیا وہ سچ مچ خوش ہوتا ہے اگر کوئی اس کی پوجا کرے، کیا واقعی اس میں جذبۂ غیظ و انتقام پایا جاتا ہے، کیا اتنی بڑی کائنات کا پیدا کرنے والا اس قدر پست و دنی بات کر سکتا ہے کہ وہ اس بڑھیا کو جہنم میں ڈالدے صرف اس خطا پر کہ اسے مسلمان ہونے کا کوئی موقعہ نہ ملا تھا۔ کیا وہ سوائے مسلمانوں کے اور تمام دُنیا کے انسانوں سے جو یقیناً مسلمانوں سے تعداد میں بہت زیادہ ہیں، ناراض ہے کیا وہ ان سب کو دوزخ کی آگ میں ڈال دے گا، کیا یہ کوئی بڑی عمدہ بات ہے کہ وہ اپنے تمام بندوں کو صرف مسلمانوں کی خوشنودی کے لئے ہمیشہ عذاب میں مبتلا رکھے۔ اُسے کس نے مجبور کیا تھا کہ وہ جہنم کا ایندھن بننے والی مخلوق اتنی تعداد میں پیدا کرے، اس سے کس نے کہا تھا کہ وہ انسان پیدا کرے بھی تو اس قدر "مجبورِ ماحول" کہ خود اس کے اختیار میں کچھ نہ ہو۔ کیا اس کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ سب کو مسلمان پیدا کرتا، کیا یہ اس کی قوت سے باہر تھا کہ دُنیا میں ہر شخص کو اسلام کے برکات سے فایدہ اُٹھانے کا موقعہ دیتا؟ پھر اگر ایسا نہیں ہے تو اس میں انسان کی کیا غلطی ہے اور وہ کیوں اس جرم کی پاداش میں پکڑا جائے جس کے کرنے پر وہ مجبور تھا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے خیالات تھے، جنھوں نے مجھے یہ سمجھنے پر مجبور کیا کہ خُدا کا وہ تصور جو عام طور پر مسلمانوں کے دلوں میں قائم ہے صحیح نہیں ہو سکتا اور اسی وقت سے میری روح میں اضطراب برپا ہے جو کسی طرح کم ہونے میں نہیں آتا۔ میں قومیت کے لحاظ سے بیشک مسلمان ہوں اور اسلام کے بتائے ہوئے اُصول کو بھی اچھا سمجھتا ہوں، لیکن اسلام کے اس عقیدہ کو کبھی

نہیں مان سکتا کہ سوائے مسلمانوں کے سب گمراہ ہیں اور اُخروی نجات سے محروم!

تصوف سے مجھے بیشک سکون ہوتا ہے اور صرف اسلئے کہ وہ خدا کے ٹکڑے نہیں کرتا۔ اسکے ہاں، ہندو، مسلمان، گبر و ترسا، یہود و نصاریٰ، سب کا خدا ایک ہی ہے، اور بہت مہربان خدا ہے۔

اورنگ زیب سیاسی حیثیت سے کتنا ہی قابل ستایش بادشاہ رہا ہو لیکن اخلاقی دنیا کا بادشا، دارا شکوہ تھا اور میں بھی اس کی طرح اس مشرب کا قایل ہوں کہ

کفر و اسلام در رہش پویاں
وحدہ لاالٰہ گویاں

اگر آپ نے اپنی کتاب میں بھی اسی پہلو کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے تو میرے نزدیک صحیفۂ آسمانی ہے، لیکن اگر آپ صرف اصطلاحاتِ تصوف میں اُلجھ گئے ہیں تو میں اسے دیکھ کر کیا کروں گا۔

حضرت، "گورکنی" کی حد ہو چکی، خدا کے لئے اب "مُردوں" سے منھ موڑ کر "زندوں" کی طرف توجہ فرمایئے! یہ کیا قیامت ہے کہ جب تک کسی کا کفن گل کر خاک نہ ہو جائے اور ہڈیاں راکھ نہ بن جائیں آپ کے نزدیک قابل اعتنا ہی نہیں۔

اسلام زندگی لیکر آیا اور زندگی ہی کا درس اس نے دیا، لیکن آپ فرماتے ہیں، اسلام نام ہے "تابوت و کفن کی یاد کا۔" اگر آپ کسی کو ہنسا نہیں سکتے، تو کم از کم رُلایئے تو نہیں، اکابر کے کارناموں کو یاد کر کے خوش ہونا چاہئے، نہ یہ کہ ان پر آنسو بہایا جائے گویا وہ کوئی بڑا رخنہ دین میں ڈال گئے ہیں!

میں آپ کی تصنیف کی کیا داد دوں، اور اس پر کیا لکھوں۔ کتاب کے اچھے ہونے میں شک نہیں۔ آپ کی زبان، آپ کی تلاش، اور آپ کی نیت سب اپنی اپنی جگہ ستایش کے قابل ہیں، لیکن افادی حیثیت سے البتہ میں اس کو بیکار سمجھتا ہوں۔ اگر اسی قسم کی رائے آپ چاہتے ہیں تو یہ حاضر ہے۔

محترم۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ مجھے اپنا وعدہ یاد تھا، لیکن دکن سے واپسی ایسی عجلت میں ہوئی کہ نہ میں بر وقت اطلاع دے سکا اور نہ سفر قطع کر کے آپ کے پاس قیام کر سکا۔ مجھے آپ سے زیادہ افسوس ہے، لیکن جانتا ہوں کہ زندگی نام ہے انھیں افسوسناک حوادث کا۔ ہم آپ کہاں تک سر دھنیں گے۔ جو ہو جائے اسی کو ٹھیک سمجھئے اور جو نہ ہو اس کا غم نہ کیجئے۔

اب آخری وقت میں جینے کا یہ ڈھب معلوم ہوا ہے، آپ بھی اس سے فایدہ اُٹھایئے۔ جس مسئلہ میں آپ نے میری تفصیلی رائے طلب کی ہے، اس کو فی الحال ملتوی کر دیجئے تو بہتر ہے، وقت آیا تو میں خود بغیر آپ کی یاد دہانی کے لکھ بھیجوں گا۔

جناب من - خط ملا، لیکن یہ رک رک کر باتیں کرنا مجھے پسند نہیں، اگر آپ مجھ سے کھل کر بات نہیں کر سکتے، تو اس ظاہرداری کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اس ترکیب سے یہ مقصود ہے کہ میرے دل کا حال آپ کو معلوم ہو جائے اور آپ کے خیال سے میں بیخبر رہوں تو میں اس کے لئے آمادہ ہوں، لیکن صاف صاف کہہ دیجئے کہ ہاں مدعا یہی ہے۔

بہر حال میں اس باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور نہ کہنے کی ضرورت۔ میرے نزدیک آپ اور وہ دونوں ایک ہیں۔ اگر آپ برے ہیں تو وہ بھی اچھے نہیں، اور اگر آپ اچھے ہیں وہ بھی ایسے برے نہیں۔ آپ کے دماغ کی راہیں جتنی پیچیدہ ہیں، اتنی ہی میری بھی ہوتیں تو شاید میں سمجھ سکتا کہ آپ کس زاویہ سے ہر معاملہ کو دیکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ سعادت مجھے نصیب نہیں ــ آپ کیوں مجھے اس مظلمہ میں گرفتار کرانا چاہتے ہیں جو تنہا آپ ہی کی "اختراعِ فایقہ" ہے۔ اس فخر میں کسی اور کا شریک ہونا آپ کی ذہانت کی توہین ہے۔

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

جنوری سنہ ۱۹۴۱ء کا "نگار"

اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک بےمثل تذکرہ ہوگا

شاعری پر انتقادی مقالات بکثرت شایع ہوتے رہتے ہیں، لیکن بتصرہ نگار ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہیں اور اسوقت تک جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان سب میں تذکرہ نگاروں نے اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کلام کیا ہے، لیکن خود شاعروں کے نقطۂ نظر کو معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔

جنوری سنہ ۴۱ء کا "نگار" موجودہ عہد کے تمام بڑے بڑے شعراء اور اچھے غزلگو حضرات کے کلام کے لئے وقف ہوگا اور جو انتخاب دیا جائے گا وہ خود شاعروں کا کیا ہوا ہوگا۔ ہر شاعر کے حالات بھی ہوں گے اور کلام پر اڈیٹر نگار کی رائے بھی درج ہوگی۔

اسوقت تک حسب ذیل شعراء کے کلام کا انتخاب آچکا ہے:

آرزو لکھنوی ــ آسی الدنی ــ جعفر علی خاں اثر لکھنوی ــ احسان دانش ــ علی اختر اختر ــ بیخود دہلوی ــ مرزا ثاقب لکھنوی ــ جلیل مانکپوری ــ جوش ملیح آبادی ــ حفیظ جالندھری ــ دل شاہجہانپوری ــ سیماب اکبرآبادی ــ فانی بدایونی ــ فراق گورکھپوری ــ پنڈت دتاتریہ کیفی ــ انند نرائن ملا ــ تلوک چند محروم ــ نیکم ناطق لکھنوی ــ نوح ناروی ــ وحشت کلکتوی ــ

حسرت موہانی ــ جگر مرادآبادی ــ مرزا یگانہ چنگیزی ــ محشر لکھنوی ــ تاجور نجیب آبادی ــ ناطق گلاوٹھوی اور بعض دوسرے شعراء کا انتخاب بھی موصول ہونے والا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

خلع بل اور مولانا کفایت اللہ

(ایک خاتون)

اخ مکرم حضرت نیاز صاحب مدفیوضہم،

تسلیمات عرض - تصدیعہ درگزر - جرائت نظر انداز، ۲۴ ستمبر کے ہفتہ وار رسالہ تہذیب نسواں میں مولوی کفایت اللہ صاحب دہلوی کا مضمون خلع بل کے متعلق میری نظر سے گزرا - جس کو پڑھکر میرے ہر بن مو سے شعلے نکلنے لگے - ہائے یہ مولوی کسقدر سنگدل ہوتے ہیں، مجھکو جناب کے سوا کوئی نظر نہیں آتا جو بے رو رعایت اس مضمون کا دنداں شکن جواب دیسکے -

ایسا جواب دیجئے کہ جو شعلے ہمارے جنت کے ٹھیکیداروں کو اپنے گرد لپکتے نظر آنے لگیں - نہ معلوم مولویوں کا عذاب کب تک ہندوستان کے مسلمانوں پر مسلط رہے گا - ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم معلقہ عورتیں کسی طرح بھی اپنی زندگی نہ سنوار سکیں - خلاصہ یہ ہے:

مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ کاظمی بل میں ایک دفعہ یہ ہونا چاہئے کہ انفساخ نکاح کا فیصلہ مسلمان ہی کی عدالت سے ہو تو جائز ہے ورنہ جو عقد دوسرے مذہب والوں کی عدالت سے فسخ ہوگا وہ ناجائز ہے اور نکاح برقرار رہے گا اور جن عورتوں نے اب تک خلع حاصل کرکے دوسرا عقد کیا ہے وہ گمراہی میں ہیں اور گناہ کر رہی ہیں ۔۔ گویا عدالت سے انفساخ نکاح کے فیصلہ کے بعد بھی عورت چھٹکارا نہ پاسکے -

برادر مکرم - یہ مولوی ایک بار اور آپ کو کافر بنائیں گے تو بنانے دیجئے، مگر اس کا جواب دیکر آپ اجر دارین کے مستحق ہوں گے اور حج اکبر کا ثواب ملے گا -

---

(نگار) خیر، حج اکبر کا ثواب تو میں اس قدر آسانی سے حاصل کرنا پسند نہیں کرتا، لیکن چونکہ خلع و طلاق کا مسئلہ ہماری معاشرت کا

نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کو کسی ایک فریق کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یقیناً مناسب نہیں، اس لئے میں اپنی رائے اس باب میں ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مولانا کفایت اللہ صاحب کی تحریر جس کا ذکر آپ نے کیا ہے، میری نگاہ سے نہیں گزری، لیکن اگر ان کی تحریر کا منشاء وہی ہے جو آپ نے بیان کیا، تو یقیناً مجھے اس سے اختلاف ہے۔

ہندوستان میں نہ اسلامی حکومت قایم ہے اور نہ اسلامی شریعت۔ اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ان کے تمام مسایل کا فیصلہ از روئے شریعت اسلامی کیا جائے، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مسایل میں "قانون محمدی" کی رو سے فیصلہ کیا جاتا ہے، لیکن قانوناً یہ امر ضروری نہیں کہ فیصلہ کرنے والا مسلمان ہی ہو۔ وراثت کے جھگڑے عام طور پر سول عدالتوں میں ہندو اور انگریز ججوں کے قلم سے بھی طے پاتے ہیں اور ہمارے علماء نے کبھی ان فیصلوں کے خلاف احتجاج نہیں کیا پھر محض خلع کے باب میں یہ قید کہ اس کا فیصلہ مسلمان ہی کی عدالت سے ہو، بالکل غیر منطقی مطالبہ ہے جس کو کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کامل غور کیا کہ مولانا کفایت اللہ صاحب نے ایک مسلمان فیصلہ کرنے والے کی شرط کیوں لگائی لیکن میری سمجھ میں اس کی کوئی دلیل نہیں آئی۔ اگر یہ قید انھوں نے اس ڈر سے لگائی ہے کہ مسلمان جج صحیح فیصلہ کرے گا اور غیر مسلم جج سے صحیح فیصلہ کی توقع نہیں کی جا سکتی، تو یہ اندیشہ بیکار ہے، کیونکہ فیصلہ کرنے والا کوئی ہو وہ قانون کی پابندی کرے گا۔ اور اس خیال سے خالی الذہن ہو کر فیصلہ کرے گا کہ خود اس کا مذہب کیا ہے۔ لیکن اگر مولانا نے یہ شرط اس عقیدہ کی بناء پر لگائی ہے کہ مشرک نجس ہے، تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک "مشرک نجس" کا فیصلہ اور تمام مسایل میں تو مان لیا جائے لیکن "خلع" کے باب میں نہ مانا جائے۔ علاوہ اس کے میں یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ ایک مسلم جج کو وہ کیوں قابل ترجیح قرار دیتے ہیں، جبکہ شاید ہی کوئی مسلمان آئی۔ سی۔ اس، مولانا کے نقطہ نظر سے صحیح معنے میں مسلمان ہو۔

اگر مولانا نے یہ شرط لگائی تھی تو اسی کے ساتھ یہ پابندی بھی عاید کرنا چاہئے تھی کہ فیصلہ کرنے والا نہ صرف نام کا مسلمان ہو، بلکہ پانچ وقت کی نماز بھی پڑھتا ہو روزہ بھی رکھتا ہو، حج بھی کر آیا ہو، باقاعدہ زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، لمبی داڑھی رکھتا ہو، کوٹ پتلون نہ پہنتا ہو، ایک سے زیادہ شادی کرنے کا مخالف نہ ہو اور اگر کوئی عورت شوہر کی بدسلوکی کی وجہ سے خلع کی خواہشمند ہو، تو اس کو عورت کی بیجا آزادی سمجھتا ہو۔

کیا اچھا ہوتا اگر مولانا ان تمام جھگڑوں کو چھوڑ کر صرف یہ شرط لگا دیتے کہ خلع کا فیصلہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس نے دیوبند میں تعلیم پائی ہو یا جو کسی اسلامی ریاست میں منصب قضا پر مامور ہو۔

خلع کا مسئلہ ہمارے علماء کے لئے ہمیشہ تردد کا باعث رہا ہے اور انھوں نے کبھی اپنی طرف سے کوئی اقدام ایسا نہیں کیا جس سے عورتیں اپنے اس حق سے فایدہ اٹھا سکتیں اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ خود اس کا ہدف بننے سے ڈرتے ہیں

نکیرین ـــ اسلام و اشتراکیت

(محمد عبدالعزیز خاں حیدر آبادی - قرول باغ - دہلی)

آج کل جو "وحی" کے متعلق بحث ہو رہی ہے اس کی وجہ سے "مولوی" بہت ہی برہم ہیں۔ اُنھیں تو چاہئے تھا کہ وہ غور کرتے اور استدلال عقلی پیش کرتے لیکن انھیں تو صرف کفر کا فتویٰ دینا آتا ہے۔ اسی سلسلہ میں دو باتوں کا جواب آپ سے چاہتا ہوں :۔

(۱) مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر ایک مسلمان کے "اعمال" لکھنے کے لئے دو فرشتے مقرر ہیں اور روزانہ اور ہر گھڑی اُس شخص کے اعمال لکھتے رہتے ہیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ فرشتے ایک "اعمال نامہ" تیار کرتے رہیں ؟ اور حشر کے دن وہ خدا کے سامنے پیش کریں اور خدا اُن کو دیکھ کر سزا یا جزا دے ـــ نعوذ باللہ کیا خدا کا حافظ اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ یاد رکھے ؟ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ یہ ایسے سوالات ہیں، جس سے میری طبیعت بے چین سی رہتی ہے۔ اور کوئی ٹھیک سا جواب نہیں ملتا کہ اطمینان نصیب ہو۔ امید کہ آپ جلد ذریعہ نگار مطمئن فرمائیں گے۔

(۲) کیا "اسلام" اور "اشتراکیت" کے اُصول ایک ہی سے ہیں ؟ ممکن ہو تو تفصیل سے بحث فرما کر سمجھائیے مشکور ہونگا

(نگار) "نکیرین" کے متعلق آپ نے ایک شاعر کا یہ اعتراض سُنا ہوگا کہ :۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اس میں شک نہیں کہ اگر نکیرین کے وجود اور کتابت اعمال کو مانا جائے تو شاعر کا یہ اعتراض بھی اپنی جگہ اٹل ہے، لیکن جس طرح شاعر کے اس قول کو محض تفنن طبع سمجھا جاتا ہے، کیوں نہ آپ عقیدۂ نکیرین کو بھی تفنن قرار دیں۔ آپ قطعاً مجبور نہیں ہیں کہ نکیرین کے وجود کو اسی طرح تسلیم کریں جس طرح عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ نکیرین کا اقرار عقیدۂ اسلام کا جزو لازم نہیں، اس لئے آپ کی طبیعت کیوں بے چین ہے۔

(۲) اسلام و اشتراکیت دونوں ایک نہیں ہیں۔ ان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہی ہے کہ "اشتراکیت" مذہب سے بے نیاز ہے اور اسلام کے سامنے سب سے بڑی چیز مسلمان ہونا ہے علاوہ اسکے اسلام نے سرمایہ داری کو گوارا کیا ہے اور اشتراکیت اسکی دشمن ہے۔ اشتراکیت شخصی استبداد کو تسلیم نہیں کرتی اور اسلام میں باوجود مشورہ کی ہدایت کے حاکم کو اپنی رائے پر عمل کرنے کا اختیار دیا گیا ہے پھر

جب اُصول ہی میں اختلاف ہے تو فروع میں اس سے زیادہ ہونا چاہئے اور ہے۔

مذہبیات

(جناب محی - میدک حیدر آباد - دکن)

آپ آزادانہ کسی مسئلہ پر غور کرنا انسان کا فطری حق سمجھتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ آپ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے آپ نے اسلام ہی کی حقیقت پر غور کیا حالانکہ دوسرے مذاہب کی تحقیق کرنا اور ان میں سے کسی ایک پر مطمئن ہو جانا یا پھر ایک نیا عقیدہ تراش لینا ہی آزادانہ فکر و غور کا نتیجہ ہونا چاہئے تھا۔ ممکن ہے آپ نے ان منازل کو طے کر کے موجودہ راستہ اختیار کیا ہو۔ میں نے بھی حتی الوسع ہر عقیدہ کی چھان بین کی ہے مگر مجھے مجبوراً اپنا مسلک علٰحدہ رکھنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ میرے ان عقاید میں قریب قریب وہ تمام باتیں شامل ہیں جو عام عقاید میں مشترک ہوا کرتی ہیں۔ ہاں میں نے اپنے اس مذہب کا کوئی نام نہیں رکھا اور نہ اس کی ضرورت محسوس کی کہ مجھے کوئی مسلمان نہ کہے جبکہ میں کسی اور مذہب اور اسلام میں کوئی فرق نہیں سمجھتا مجھے ہرگز ناگوار نہ ہو اگر لوگ مجھے ہندو، یہودی، عیسائی یا جو جی میں آئے کہیں یہی وجہ ہے کہ جب لوگ میرے نام کی نسلی رعایت سے مجھے مسلمان کہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا، اور اگر میرے عقاید سے واقف ہو کر کوئی مسلم مجھے مرتد ملحد کہتا ہے تو میں یقین کے ساتھ اُسے صحیح سمجھتا ہوں اور کیوں نہ سمجھوں۔ اسلامی عقاید کے مطابق تو جو خدا و رسول یا احکامات قرآن پر ایمان نہ رکھے وہ مرتد و ملحد ہی ہوتا ہے اور مجھے واقعی خدا کے وجود سے انکار ہو تو سمجھ لیجئے کہ بقیہ لغویات کو میں کہاں تک باور کر سکتا ہوں۔

اس سلسلہ میں مجھے آپ سے ہمیشہ غائبانہ حسن ظن رہا کیونکہ میں اس مغالطہ میں تھا کہ آپ بھی میرے ہی ہم مشرب ہیں۔ یہ تو اب معلوم ہوا کہ آپ بھی مسلمان ہی ہیں مگر اپنے اسلامی عقاید کے عقلی دلایل بھی رکھتے ہیں اور جیسا کہ آپ کا بیان ہے عام علمار اسلام اپنے عقاید کے عقلی دلایل نہیں رکھتے۔ بہر حال مجھے آپ لوگوں کی اس بحث سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے ہاں تو بحیثیت مسلمان آپ میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں۔ فروعات و جزئیات میں تو ہر شخص دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف خیال رکھتا ہی ہے۔

میں مذہبی مضامین بہت کم یا بقدر ضرورت پڑھ لیا کرتا ہوں مگر جب کبھی مذہب و سائنس کی بحث کسی مضمون میں چھڑ جاتی ہے تو اپنے عقاید کی تنقیح کی خاطر اُسے بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ آپ کے حالیہ تردیدی مضامین میں جو علمار کی لے دے پر نگار میں شایع ہوئے مجھے توقع تھی کہ میرے ہی معتقدات کی صاف صاف وضاحت عقلی دلایل سے کی گئی ہوگی۔ مگر

میری توقع پوری نہ ہوئی۔

خیر — آپ نے اپنے شبہات کی ایک فہرست نگار بابت اگست سنہ ۴۰ء میں ارقام فرما کر علماء اسلام سے اس کا تسکین بخش جواب طلب فرمایا ہے۔ مگر میں آپ سے اپنی تسکین خاطر کے لئے ان سوالات سے پہلے اپنے سوالات کا ایسا حل چاہتا ہوں جو عقل کی کسوٹی پر کھرے اُتر سکیں۔ امید کہ مجھے مطمئن کرنا آپ اپنا انسانی فرض سمجھیں گے۔

۱۔ خدا کیا ہے؟ اور ہے بھی کہ نہیں! دُنیا اور انسان کو کس نے پیدا کیا اور کیوں؟

۲۔ جن، فرشتے، پیغمبر، رسول اور انسان کی علٰحدہ علٰحدہ کیا صحیح تعریف ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہی بنیادی سوالات یا شبہات ہیں جن کا پہلے حل ہونا ضروری ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے جب کبھی اپنے گرد و پیش کا آزاد مطالعہ شروع کیا ہوگا تو ضرور اس منزل سے ابتداہی میں گزرے ہوں گے جس سے میں اس وقت گزر رہا ہوں اور جس طرح آپ کی تسکین ہوئی ہو اسی طرح میری بھی فرمایئے۔

دیگر علماء سے بھی اس مسئلہ میں مدد لیجا سکتی تھی مگر آپ کا انتخاب محض اس لئے میں نے کیا کہ آپ عقل کی کسوٹی پر عقاید پرکھا کرتے ہیں اور اسی اُصول پر میں بھی اپنے شبہات کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) آپ کو چاہئے تھا کہ اپنے شبہات آپ ان علماء کرام کے سامنے پیش کرتے جن کے نزدیک اسلام کا تعلق ان اصطلاحی معتقدات سے ہے اور جو قرآن کے مغز پر اتنی زیادہ توجہ صرف نہیں کرتے جتنی اس کو "کسوت" پر۔ لیکن حیرت ہے کہ آپ یہ باتیں مجھ سے پوچھتے ہیں جو مذہب و اخلاق میں کوئی فرق نہیں سمجھتا اور جس نے اصطلاحات مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

آپ خدا، رسول، جن اور فرشتوں وغیرہ کے متعلق میرا عقیدہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا نگار آپ کی نگاہ سے نہیں گزرتا۔ آپ اگست کے ملاحظات ہی ملاحظہ فرمایئے، آپ کو ان تمام باتوں کی صراحت اس میں مل جائے گی۔ رہا خدا کو ماننا یا نہ ماننا، میں نے اس مسئلہ کو کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ ایک قوت مجردہ کا ماننا ضروری ہے اور اس کے کوائف سے بحث کرنا بالکل بیکار ہے کیونکہ نہ ہم اس کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کا سمجھنا ہمارے لئے مفید۔

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

نگار سائز کے ۲۴۳ صفحات پر ——— قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

نظم اُردو

جناب سید ابوالعلاء حکیم ناطق لکھنوی کی تصنیف ہے - اس تصنیف کی بنیاد ناطق صاحب کی وہ نظم ہے جو نگار کے اُردو شاعری نمبر میں شایع ہو چکی ہے لیکن اب اس کو کثیر حواشی کے ساتھ کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے -

نظم صرف ۵۰ بند کی ہے، لیکن کتاب ۱۲۰ صفحات کی ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس متن کی شرح و تفسیر کسقدر بسیط ہو گئی ہے -

اُردو نثر و نظم کے متعلق شاید ہی کوئی تاریخی اطلاع ایسی ہو جو اس کتاب میں نہ پائی جاتی ہو اور اس میں شک نہیں کہ ناطق صاحب نے ان تمام اطلاعات کی جمع و ترتیب میں بہت محنت و کاوش سے کام لیا ہے -

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ جو معلومات اس میں فراہم کی گئی ہیں ان میں شک و اختلاف کی گنجایش نہیں[1]، کیونکہ دنیا کی کوئی تاریخی یا انتقادی تصنیف اس قدر مکمل نہیں ہو سکتی، لیکن اس کا اکثر و بیشتر حصہ یقیناً استنادی حیثیت رکھتا ہے -

شروع میں ملک کے بعض اکابر کی رائیں بھی کتاب میں شامل ہیں اور ناطق صاحب نے ان کے حصول میں جس قدر کاوش سے کام لیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید وہ بغیر ان رایوں کے کتاب کو مکمل نہ سمجھتے تھے، درانحالیکہ تصنیف کی اصل خوبی اس "مدحت طرازی" کی محتاج نہ تھی، جس حد تک نظم کا تعلق ہے وہ بالکل بے عیب ہے سوائے اسکے کہ ایک جگہ انھوں نے عجمی کو سکون جیم کے ساتھ نظم کیا ہے، ممکن ہے ضرورت شعری کے لحاظ سے جایز ہو -

بہرحال ناطق صاحب کی یہ تالیف قابل قدر چیز ہے اور وہ حضرات جو اُردو زبان سے دلچسپی رکھتے ہیں یا اس زبان کے متعلق فوری حوالہ کے لئے کوئی کتاب اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے -

کتاب کی قیمت دو روپیہ ہے - جناب مصنف سے کنٹونمنٹ روڈ لکھنؤ کے پتہ پر خط و کتابت کی جائے -

رگبی کی زندگی

ترجمہ ہے انگریزی کی مشہور تصنیف "ٹام براؤنس اسکول ڈیز" کا جو ٹامس ہیو کی زندگی کا خاص ادبی کارنامہ سمجھا جاتا ہے - اس میں مدرسۂ رگبی کے واقعات کو افسانہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور نقد و تبصرہ کی یہ صورت بالکل "ٹامس ہیو" کی ایجاد ہے - یہ ترجمہ مکتبۂ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے اور عہ اس کی قیمت ہے -

---

[1] حکیم صاحب نے صفحہ ... پر ایک جگہ لکھا ہے کہ امیر خسرو ساتویں صدی ہجری میں لکھنؤ آئے تھے، حالانکہ اسوقت شاید لکھنؤ کا وجود بھی نہ تھا، وہ لکھنوتی ضرور گئے تھے لیکن لکھنؤ تاریخ میں نہیں آیا

انگلستان کا طریقۂ حکومت یہ رسالہ مکتبۂ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ انگلستان کا اصولِ حکومت کیا ہے۔ سرورق پر ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کتاب بتدیوں کے لئے لکھی گئی ہے، حالانکہ میرے نزدیک، اس کا مطالعہ مبتدی و منتہی دونوں کے لئے مفید ہے۔ شانتی سروپ شاستری نے اسے مرتب کیا ہے اور ایسی سہل و صاف زبان میں کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے۔ قیمت ۵ ر ہے۔

خنداں مجموعہ ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ان مزاحیہ تقریروں کا جو ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر ہو چکی ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صاحب کے مزاحیہ مضامین کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، خوب لکھتے ہیں اور اپنے مخصوص رنگ کو کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ رشید صاحب مشکل اُردو لکھنے والے ہیں اور مشکل اُردو میں مزاح کی تشکیل ان کی خصوصیت خاصہ ہے۔

ہر چند یہ تمام مضامین وہ ہیں جو مقررہ عنوانات پر فرمائش سے لکھے گئے ہیں اور ایک مزاحیہ نگار کو جو آزادی ملنی چاہئے وہ رشید صاحب کو نہیں ملی، تاہم جس طرح "طرح" کی تمام غزلیں بری نہیں ہوتیں، اسی طرح یہ مضامین بھی بڑی حد تک رشید صاحب کے مزاحیہ رنگ کے حامل ہیں، گو انھیں "اضافۂ توصیفی" کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے خط و کتابت کی جائے۔

سلسلۂ تعلیم و ترقی کے رسایل مکتبۂ جامعۂ دہلی نے بالغ بتدیوں کی تعلیم کے لئے ایک سلسلہ چھوٹے چھوٹے رسایل کا شروع کیا ہے، جن کے ذریعہ سے مذہب، اخلاق، تاریخ، ادب اور بہت سی کام کی باتوں کی تعلیم دیجاتی ہے۔

ایک ایک آنہ ان کی قیمت ہے۔ فہرست مکتبۂ جامعہ سے طلب کی جائے۔

جادۂ نو مجموعہ ہے جناب احسان دانش کے دو شعری قطعات کا جن میں انھوں نے اپنے تاثرات دُنیاوی اور مظاہر مادی کو شاعرانہ تخئیل کے ساتھ نادر استعارات و تشبیہات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ کی ابتدا سب سے پہلے امین حزیں نے کی تھی لیکن شعریت اس میں کم تھی، اس کے بعد اختر انصاری نے اس رنگ کو بہت اُبھارا، پھر جوش و احسان نے۔

ٹگور کے تتبع میں اس رنگ کی نثر تو پہلے بھی لکھی جاتی تھی، لیکن نظم میں یہ رنگ پیش کرنا بعد کی بات ہے۔ جناب احسان اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کا اندازہ آپ ذیل کے قطعات سے کر سکتے ہیں:

بے زری اور اس میں ان کا خیال — اک تجلی سی ہے نگاہوں میں
دل پہ ایسا سماں مسلط ہے — چاندنی جیسے خانقاہوں میں

دلی کا اک رئیس بہ ہنگامِ جانکنی ، سر دھن رہا تھا چارہ گروں میں گھرا ہوا
جیسے فسوں گروں کے جھمیلے میں نیم شب کھیلے سیاہ ناگ کا تازہ ڈسا ہوا

جب کسی کی یاد آکر تلملا جاتا ہے دل جگمگا اُٹھتی ہے کچھ اس شان سے بزمِ دماغ
جیسے ساون کی برستی رات میں اک نازنیں صحن میں زینے سے اُترے ہاتھ میں لیکر چراغ

بڑ کے سایہ میں چاندنی کا سماں تیرگی میں ہیں نور کے پیوند،
جیسے حساس آدمی کی حیات ہو زیادہ ملول کم خورسند،

یہ مجموعہ مکتبۂ دانش مزنگ لاہور سے ملسکتا ہے۔

ایثار جناب نور الحسن صاحب نے ہمارے معاشرہ کے بعض مسایل کا افسانہ کے رنگ میں بحث کی ہے جو بحیثیت مجموعی کافی دلچسپ ہے۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ: معتمد انجمن ترقی اُردو حیدر آباد (دکن)

خیال آفریں دماغ جناب عرش تیموری کا مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں تجزیۂ نفسیاتی سے کام لیتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

اندازِ بیان دلکش ہے اور جو اثر اس کے مصنف نے پیدا کرنا چاہا تھا اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔
قیمت ۶ر، ملنے کا پتہ: حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر، دہلی

مصر کی رقاصہ ترجمہ ہے موسیو گیلے کے آپرا "تائیس" کا۔ اناطول فرانس کا ناول تائیس بہت مشہور چیز ہے اور اسی کو سامنے رکھ کر موسیو گیلے نے آپرا لکھا تھا، جس کا ترجمہ اُردو میں جناب پطرس نے کیا ہے۔

ہر چند آپرا کا ترجمہ کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ اس کا تعلق زیادہ تر سماعت و بصارت سے ہے، لیکن فاضل مترجم نے تمام خلایا کو الفاظ سے پُر کرکے ایک تمثیل کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی بیکار ہے، جیسا پطرس کے متعلق یہ ظاہر کرنا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں

کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور ہاشمی بک ڈپو لاہور سے مل سکتی ہے۔

باغِ دلکش جناب سید مسعود حسن صاحب مسعود (علیگ) بی۔ سی۔ اس کے کلام کا مجموعہ ہے، ابتدائی ۵ صفحات انتساب، التماس، تعارف، مقدمہ اور تبصرہ کے لئے وقف ہیں۔ اس کے بعد معلومات شاعری پر ایک بسیط مقالہ مصنف کا نظر آتا ہے جس میں شاعری کے عیوب و محاسن پر فنی نقطۂ نگاہ سے مفید بحث کی گئی ہے

اصل مجموعہ غزلیات سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد وہ قصاید و منظومات ہیں جو رؤساء وغیرہ کی شان میں لکھے گئے ہیں اور پھر قطعات تاریخ ہیں۔ غزلوں کا رنگ وہی ہے جو لکھنؤ کے آخری دور کے شعراء کا تھا اور قصاید بھی اسی انداز کے ہیں جو عام طور پر لوگوں کی تعریف میں اختیار کیا جاتا ہے۔ مقدمہ جناب آسی صاحب کا لکھا ہوا ہے اور تبصرہ سراج لکھنوی کا۔ یہ مجموعہ غالباً جناب مسعود حسن صاحب سے تاج پور ضلع لکھیم پور کھیری کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

گل نغمہ جناب صفا حیدرآبادی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے مولوی علی اختر صاحب نے تعارف کرتے ہوئے، ان کے مستقبل کی طرف سے بہت اطمینان کا اظہار کیا ہے اور وہ ان کی تلاش مضمون کے معترف ہیں۔ قیمت ۲ر ہے اور ملنے کا پتہ میر حیدر علی صفا یاقوت پورہ حیدرآباد (دکن) ہے۔

آسان اردو مجموعہ ہے حیدرآباد کے مختلف اہل قلم کے مضامین کا پہلے حصہ میں بعض اکابر کے حالات پائے جاتے ہیں۔ دوسرے میں تین سماجی کہانیاں ہیں اور تیسرے حصہ میں جدید معلومات۔ آخری حصہ نظموں، رباعیوں اور غزلوں کا ہے۔ لیکن ہر جگہ "آسان اردو" کے خیال کو سامنے رکھا گیا ہے اور اسی کے خیال کے تحت انتخاب کیا گیا ہو۔ قیمت ۸ر ہے۔

اسلامی تعلیم یہ رسالہ ظہیر احمد صاحب عثمانی نے چھوٹے بچوں کے لئے لکھا ہے۔ اس میں انھیں چند ابتدائی معتقدات کو پیش کیا گیا ہے جو عام طور پر جزو ایمان سمجھے جاتے ہیں۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ کتاب خانہ "سعادت" بازار ڈوگراں لاہور

ہمارے بزرگ اس کتاب میں رشید اختر ندوی نے مسلمان بچوں کے لئے خلفاء اربعہ کے حالات سہل زبان میں یکجا کر دئے ہیں۔ قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ کتاب خانہ "سعادت" لاہور

تذکرۃ الانصار اس رسالہ میں جناب حکیم شمس الحق صاحب انصاری زیدی نے پارچہ باف قبیلوں کی اصل و حقیقت سے بحث کر کے بتایا ہے کہ جن کو جلاہا کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت انصاری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ذات پات کی تقسیم کو ہمیشہ برا سمجھا ہے اور محض کسی پیشہ اختیار کر لینے کی وجہ سے کسی قوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنا بدترین لعنت ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ مسلمان اب اصل مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور صرف "نسب فروشی" ہی کو شرافت سمجھتے ہیں۔

یہ رسالہ ۲ر میں شمس دواخانہ ترہٹ کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

جنگ آلودہ دنیا جناب وینکٹیش نرائن تیواری نے موجودہ جنگ کے متعلق یہ مفید کتاب لکھی ہے۔ اس کے پہلے حصہ میں جنگ کے اہم واقعات کی فہرست دیگئی ہے، دوسرے حصہ میں مختلف ملکوں کے نقشے اور چارٹ ہیں، تیسرے حصہ میں چند مفید و کارآمد ضمیمے دئے گئے ہیں۔ موجودہ جنگ کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ فایدہ سے خالی نہیں۔

ملنے کا پتہ انڈین پریس الہ آباد ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

اقبال کی شاعری مولانا عبدالمالک آروی کی تصنیف ہے اور غالباً سب سے پہلی انتقادی تصنیف جس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ اقبال کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے اقبال کی سخن گوئی پر صرف سخن سنج، بلکہ ایک آرٹسٹ، اور فلسفی کی حیثیت سے بھی تبصرہ کیا ہے اور ہر ممکن پہلو کو سامنے رکھ کر اس پر گفتگو کی ہے۔

اس کا پہلا اڈیشن ۳۲ء میں شایع ہوا تھا، لیکن اس کی مانگ اتنی زیادہ ہوئی کہ اب یہ دوسرا اڈیشن تین جزو کے اضافہ کے ساتھ شایع کرنا پڑا۔ اخیر میں کلام اقبال کا انتخاب بھی دیدیا گیا ہے جس نے اس کتاب کی افادی حیثیت کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ آرہ کا "ادارۂ طاقِ نسیاں" جس کے خالق و محرک مولانا عبدالمالک ہی ہیں، مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے اس کتاب کو شایع کرکے اُردو کے انتقادی لٹریچر میں ایک معیاری چیز ملک کے سامنے پیش کی۔

الہامات شاد ادارۂ طاق نسیاں آرہ کے سلسلۂ مطبوعات کی تیسری کتاب ہے۔ اس میں مولانا عبدالمالک آروی نے پہلے شاد عظیم آبادی کی سیرت بیان کی ہے اور پھر ان کے کلام پر ایک فاضلانہ تبصرہ کرکے شاد کی شاعری کے حقیقی اجزا کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے اس حق کو پوری طرح ادا کیا ہے جو بہاری ہونے کی حیثیت سے ان پر عاید ہوتا تھا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ بہاری اسکول کی شاعری سمجھنے کے لئے کوئی شخص اس کتاب کے مطالعہ سے کیونکر بے نیاز ہو سکتا ہے۔

اخیر میں شاد کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے جس میں ان کے ہر رنگ کو سامنے رکھا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ: ادارۂ طاق بستان آرہ

شہاب کی تخئیل مجموعہ ہے جناب افسر صدیقی امروہوی کے کلام کا جس میں غزلیں، قصیدے، نظمیں اور ترجیع بند وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔

افسر صاحب پرانے کہنے والے ہیں اور کثرتِ مشق سے کلام میں استادانہ سلاست و شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ مختلف ادبی صحبتوں میں آپ کو چند خطابات بھی مل چکے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پبلک آپ کی قدر کرتی ہے اور آپ کے کلام کو پسند کرتی ہے۔ آپ کا کلام رکیک و سخیف مضامین سے پاک ہے اور صحیح رنگ تغزل کے اشعار بھی اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔

نئی پود جناب ازہر قدوائی کے افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں روز کے واقعات و تجربات کو سامنے رکھ کر اجتماعی نقطۂ نظر سے ہمارے معاشرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں لفاظی تو نہیں ہے، لیکن مفید باتیں ضرور ہیں۔ زبان صاف و سلیس اور انداز بیان دلنشین ہے۔ کتابت و طباعت بھی بہت پاکیزہ ہے۔

قیمت ایک روپیہ اور ملنے کا پتہ شرکت ادبیہ دہلی۔

انتقام

بیستوں سے آج جوئے شیر لانا ہے مجھے — شمع اک، آغوش طوفاں میں جلانا ہے مجھے
دل کے شعلوں سے لگی دل کی بجھانا ہے مجھے — آج اپنی قوتِ دل آزمانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

دُشمنِ ادراک سے لینا ہے مجھ کو انتقام — رہزنِ بیباک سے لینا ہے مجھ کو انتقام
اِک بُتِ سفاک سے لینا ہے مجھ کو انتقام — یاد میں اُس کی خود اُس کو بھول جانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

چاند سے خُنکی، گہر شبنم سے، تاروں سے چمک — رنگ و بو گل سے ہنسی غنچوں سے، شاخوں سے لچک
مستیاں مے سے، گھٹا سے کیف، نغموں سے کھٹک — حُسن لجائے جہاں بھی لوٹ لانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

چھین لانا ہے مجھے اب حُسن سے تیغ و سناں — حُسن سے تیغ و سنان اور عشق سے تیر و کماں
عشق سے تیر و کماں تقدیر سے سود و زیاں — بخت و حسن و عشق کو یکجاں بنانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

رات ہو یا دن ہو مثلِ ابرِ باراں روئے جا — جتنا رویا جائے تجھ سے روئے جا ہاں روئے جا
حوصلہ باقی نہ رکھ اے چشمِ گریاں روئے جا — دردِ دل پر ہنسنے والے کو رُلانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

توڑ کر ہر ساز اب نغمات سے کھیلوں گا میں — بھر کے غم رگ رگ میں احساسات سے کھیلوں گا میں
ٹکڑے ٹکڑے کر کے دل جذبات سے کھیلوں گا میں — کھیل میں تقدیر کو اپنی لگانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

وسعتِ دُنیائے امکاں تنگ ہے میرے لئے — بیخودی ہو یا خودی اب ننگ ہے میرے لئے
ہر نفس گویا پیامِ جنگ ہے میرے لئے — کُرسی و لوح و قلم توڑ دیں، لانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

حسرت و ارماں کی بنیادیں ہلا دوں تو سہی — عشق سے رسمِ طلب یکسر مٹا دوں تو سہی
باش اے تمکیں خدا کو بھی بھلا دوں تو سہی — بھول جانے کے سوا سب بھول جانا ہے مجھے
بھولنے والے کو اپنے یاد آنا ہے مجھے

تمکین (سرمست)

غزل : اثر لکھنوی

امید تسلی سے گھبرانے کو کیا کہئے
اب اس دل وحشی کے سمجھانے کو کیا کہئے

بیتاب تماشا دل، محروم تماشا ہے
آغوشِ تجلی میں غش آنے کو کیا کہئے

جس دل کی تمنائیں سرمایۂ ہستی تھیں
اُس دل کی تمنائیں مٹ جانے کو کیا کہئے

مانا کہ حیا آئی مشتاق نگاہوں سے
خود اپنی اداؤں سے شرمانے کو کیا کہئے

مشکل سے جو اُٹھی تھیں پلکوں کے سہارے سے
ملتے ہی اُن آنکھوں کے جھک جانے کو کیا کہئے

جب دل کے دھڑکنے میں آغوش کی تنگی تھی
آغاز محبت کے افسانے کو کیا کہئے

جس وقت نسیم آئے پیغام سحر لے کر
گلبرگ پہ شبنم کے تھرانے کو کیا کہئے

دیتے ہو تسلی بھی اور ہاتھ بھی ملتے ہو
سمجھانا اگر یہ ہے، تڑپانے کو کیا کہئے

گردش تھی ابھی مبہم ساقی کی نگاہوں کی
پھر بھی جو چھلک جائے، پیمانے کو کیا کہئے

جب پھول مہکتے ہوں اور چاندنی چھٹکی ہو
جاگی ہوئی آنکھوں کے بھر آنے کو کیا کہئے

اک شعلۂ مضطر سے بن بن کے تپش لپٹا
دیوانہ نہ کہئے تو پروانے کو کیا کہئے

مستقبل تازہ ہے جو خاک کا ذرہ ہے
جب زیست مسلسل ہے، مر جانے کو کیا کہئے

نالوں نے اثرؔ کے پھر ہنگامہ کیا برپا
منھ پھیر کے پھر کہہ دو "دیوانے کو کیا کہئے"

غزل : کوکبؔ عارفی

کس مصیبت میں ہوں میں اے ہمنوا اُسکے لئے
ہر نفس اُس کے لئے ہر مدعا اُس کے لئے

میری ہر کوشش کی تہ میں موجزن اُسکی تلاش
ابتدا اس کے لئے ہے انتہا اُس کے لئے

میں نے کلیوں میں اُسے پایا تبسم آشنا
خوشنما پھولوں کو میں دیکھا کیا اُس کے لئے

جو نہ کہنا چاہئے تھا وہ کہا احباب نے
جو نہ سننا چاہئے تھا وہ سنا اُسکے لئے

میرے قبضے میں نہیں ہیں ہجر کی مجبوریاں
آرہی ہے دل سے رونے کی صدا اُسکے لئے

گم ہوا ہوں اس طرح کوکبؔ میں اسکی یاد میں
اُس سے پوچھا بارہا اپنا پتا اُس کے لئے

مشاہدہ اور پیام

شاعر اور کائنات

یہ کس نے کیا ذکرِ تمنّا مرے آگے
لہرانے لگا، خون کا دریا مرے آگے
ہر حال میں سُنتا ہوں محبت کی کہانی،
ہر ذرۂ خاموش ہے گویا مرے آگے
ہونے دو ابھی ساغر و مینا میں تصادم
بہنے دو ابھی نور کا دریا مرے آگے
محراب حرم کا نہ کرو ذکر خدا را
جب تک ہے خم ابروئے سلمیٰ مرے آگے
اللہ رے! ترے در پہ مری خاک نشینی
ہیں خاک بسر قیصر و کسریٰ مرے آگے
ہر ذرہ ہے ناہید و ثریا مرے نزدیک
ہر خار ہے گلگشتِ مصلّیٰ مرے آگے
دیکھی ہے مری آنکھ نے کلیوں کی تباہی
اُٹھا ہے تبسم کا جنازا مرے آگے
اُلجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں
تو اور ہو مجروحِ تماشا مرے آگے

کونین کو ماہر مرے قدموں پہ جُھکانا،
جسوقت کہ ہو گنبدِ خضریٰ مرے آگے

اُمید کیا ہے؟

یہ قوسِ قزح ہے، اور وہ تارے ہیں
غمہائے نشاط ہی کے سب مارے ہیں
اُمید کے خوشنما کھلونوں کو نہ چھو،
تو پھُول سمجھتا ہے یہ انگارے ہیں

فلسفی سے!

ترے جلووں میں تابانی نہیں ہے
تری تخلیق فارانی نہیں ہے
زمانہ کو بدل سکتا نہیں تو
کہ تجھ میں جذب طوفانی نہیں ہے

ماہر القادری

غزل : فراق گورکھپوری

اب انقلاب کو دُنیا میں عام ہونا ہے
کوئی کرے نہ کرے یہ تو کام ہونا ہے،

نکل رہیں گے ہزاروں نشاط کے پہلو
ابھی فسانۂ غم کو تمام ہونا ہے

اسی پر ایک جدائی کی رات بھاری ہے
وہ کیفِ غم جسے کیفِ دوام ہونا ہے

اثر ہے ظلمتِ ماضی کا دورِ حاضر پر
ہر ایک صبح کو دُنیا میں شام ہونا ہے

قریب منزلِ مقصود آگئی لیکن
مسافروں کو بھی کچھ تیز گام ہونا ہے

ہر ایک روپ میں تیرا ہی رنگ جھلکے گا،
ہر ایک نام کو تیرا ہی نام ہونا ہے

نظامِ دہر مکمل بھی ہو کے برہم ہے
کہ عشق کا بھی کوئی انتظام ہونا ہے

جہاں میں یوں بھی نئی روح پھونک دیتے ہیں
عروسِ مرگ کا تجھکو پیام ہونا ہے،

وہ تیغ زہر میں جس کو بجھا چکا ہے عشق
اب آج کل میں اُسے بے نیام ہونا ہے

رُکے تو پاس چلے تو وہی نسیم مراد
سکونِ غم کو بھی اب خوش خرام ہونا ہے

غم و خوشی کو سمجھتے ہیں زندگی جو فراق
یہ زندگی ابھی اُن پر حرام ہونا ہے،

غزل : راج بلدیو راج

آزادیٔ غم ہے مجھے اس دور میں حاصل
آزاد کوئی جس میں نظر ہے نہ کوئی دل،

ہے دور بہت دیر و حرم سے مرا معبد
زنار کا بندہ ہوں نہ تسبیح کا قائل

لرزیدہ ہے تو بادِ مخالف سے ۔ وگرنہ
ہر موج کے آغوش میں مستور ہے ساحل

تعمیر تو مانا کہ بڑی چیز ہے لیکن،
تخریب بھی ہے قسمتِ تعمیر میں داخل

تو چاہے تو تلوار کی قسمت کو جگا دے
تجھ میں وہ جھلکتا ہے ابھی جوہرِ قابل

ان دونوں پہ ہے عشق کے ہنگامے کی بنیاد
دونوں ہیں خطا وار، تری آنکھ ۔ مرا دل

بے سُرخی و بے رنگ ہے افسانۂ ہستی
جب تک کہ لہو دل کا نہ اشکوں میں ہو شامل

جرأت کو بڑھا دیتی ہے زنجیر کی جھنکار
زنداں بھی ہے اک مکتبِ آزادیٔ کامل

زنداں کی طرف چل تو سہی جوشِ وفا میں
زنداں سے نکلوائیں گے خود طوق و سلاسل

ناداں تجھے دُنیا میں کہیں خوار نہ کر دے
یہ موسمِ بیکار میں تزئینِ محافل

مانا کہ عجب شے ہے غمِ عشق و غمِ دوست
یہ شرط ہے لیکن غمِ ہستی نہ ہو شامل

غزل : قیصر امراؤتی

خیالِ عشرتِ ناپائیدار رہنے دے
خزاں نصیب امیدِ بہار رہنے دے

جنونِ عشق میں پروا نہ کر زمانے کی
جو تہمتیں ہوں ترے سر ہزار رہنے دے

نہ مڑکے دیکھ گزشتہ کو رہروِ منزل
اُٹھا ہی کرتے ہیں اکثر غبار رہنے دے

ہجومِ یاس میں تسکیں کا کچھ تو ساماں ہو
دُعا کا دل میں فقط اعتبار رہنے دے

خلش نہ ہو تو نہیں لطفِ زندگی قیصرؔ
نہیں ہے کچھ تو غمِ روزگار رہنے دے

غزل : جگرؔ بریلوی

جلوؤں میں حسن کے ہیں تقاضے نہاں کئی
ہیں ساتھ ساتھ عشق کے ارمانِ جاں کئی

آساں بہت ہے کہنے کو یوں راہ بے دلی
تھک تھک کے رہ گئے ہیں یہاں کارواں کئی

دیکھی ہیں ہم نے اُن کی تلون مزاجیاں
گزرے ہیں ہم پہ دورِ بہار و خزاں کئی

مانا بہت جنوں نے سبکدوش کر دیا
سر ہے تو سر کے ساتھ ہیں بارِ گراں کئی

تعمیرِ دل بنا کے بھی دیکھو تو ایک بار
تم نے بنا بنا کے بگاڑے جہاں کئی

ہر چند بر سبیل شکایت نہیں، مگر
شکوے ہیں آپ سے مجھے اے مہرباں کئی

غفلت کبھی، ملال کبھی اور جنوں کبھی
اُن کے میرے حجاب رہے درمیاں کئی

تیرے ہی سنگِ در پہ مٹا دردِ بندگی
سر رکھ کے ہم نے دیکھ لئے آستاں کئی

تسکینِ جاں ہو جس سے وہی مل سکا نہ آہ
ملنے کو دلنواز ملے مہرباں کئی

کیا زندگی سے ہو کوئی عہدہ برآ جگرؔ
اک جانِ زار اور غمِ جانستاں کئی

غزل : نظرؔ حیدر آبادی

تو غم سے نگاہیں پھیر تو لے، بدمست تو بن، سرشار تو ہو
دُنیا کی جبیں جھک جائے گی دُنیا سے ذرا بیزار تو ہو!

سب ہم پہ ہنسنے والے ہیں، سینوں میں انکے پتھر ہیں
افسانۂ غم یاں کس سے کہیں، محفل میں کوئی غمخوار تو ہو

کہنے کو تو اب بھی آتی ہے، سرشار ہوا بدمست گھٹا
اس بادۂ موسم سے حاصل، ہاں دل میں کوئی آزار تو ہو

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہازران کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی وکراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

نئی وضع کے سات جہازوں کا شاندار بیڑہ، جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس "اسلامی"

(وزن ۵۸۷۹ ٹن) بھی شامل ہے۔ گزشتہ موسم حج میں جبکہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت

زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن۔ جدہ اور بحرِ احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشش

تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں۔

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں۔

تفصیلات کے لئے خط وکتابت کیجئے

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ بمبئی